ربیع الاول ۱۴۴۴ھ
اکتوبر ۲۰۲۲ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

- حالیہ سیلاب اور سینٹ کام
- فکر و عمل کی تعمیر کا نبویؐ طریق
- اَعمال میں اخلاص

فلسفۂ انقلاب کے نقطۂ نظر سے
سیرت النبی ﷺ کا اجمالی مطالعہ

منہجِ انقلابِ نبویؐ

غارِ حرا کی تنہائیوں سے لے کر
مدینۃ النبیؐ میں اسلامی ریاست کی تشکیل
اور اس کی بین الاقوامی توسیع تک'
اسلامی انقلاب کے مراحل' مدارج اور لوازم پر مشتمل

بانیٔ تنظیم اسلامی
محترم **ڈاکٹر اسرار احمد** رحمۃ اللہ علیہ
کے دس خطباتِ جمعہ کا مجموعہ

(جدید نظر ثانی شدہ ایڈیشن)

صفحات: 360 — قیمت: 500 روپے

"منہجِ انقلابِ نبویؐ" کے مباحث کی تلخیص پر مشتمل کتابچہ

رسولِ انقلاب ﷺ کا طریقِ انقلاب

صفحات: 64 — قیمت اشاعت خاص: 125 روپے — اشاعت عام: 60 روپے

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور

36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور' فون: 3-35869501

وَاذۡکُرُوۡا نِعۡمَۃَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ وَمِیۡثَاقَہُ الَّذِیۡ وَاثَقَکُمۡ بِہٖۤ ۙ اِذۡ قُلۡتُمۡ سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا ۫ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد	:	71
شمارہ	:	10
ربیع الاوّل		1444ھ
اکتوبر		2022ء
فی شمارہ	:	40 روپے

سالانہ زرِ تعاون: 400 روپے

مُدیر
حافظ عاکف سعید

مجلس ادارت:
ایوب بیگ مرزا، خورشید انجم

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

ادارتی معاون:
حافظ محمد زاہد، محمد خلیق

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقامِ اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700، فون: 3-35869501
فیکس: 35834000، ای میل: maktaba@tanzeem.org
ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
رابطہ برائے ادارتی امور: (042)38939321
publications@tanzeem.org
ویب سائٹ: www.tanzeem.org
مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: "دارُالاسلام" ملتان روڈ چوہنگ لاہور
(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 78-(042)35473375
پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال		5
حالیہ سیلاب اور سینٹ کام	ایوب بیگ مرزا	
بیانُ القرآن		9
سورۃ التحریم	ڈاکٹر اسرار احمدؒ	
حُسنِ معاشرت		26
اپنے آپ اور اپنے اہلِ خانہ کو آگ سے بچاؤ!	سعادت محمود	
تجلّیاتِ سیرت		33
فکروعمل کی تعمیر کا نبویؐ طریق	راحیل گوہر صدیقی	
حقیقتِ دین		43
اَعمال میں اِخلاص	احمد علی محمودی	
تذکیرو موعظت		59
موت: ایک اٹل حقیقت	حافظ محمد اسد	
سیرتِ صحابہ رضی اللہ عنہم		67
حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ	ارسلان اللہ خان	
انوارِ ہدایت		71
اہلِ جہنّم کی چیخ و پکار اور آرزو	پروفیسر محمد یونس جنجوعہ	
ظروف و احوال		79
یہودیوں پر اُمّتِ مُسلمہ کے احسانات	رضی الدین سیّد	

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

حالیہ سیلاب اور سینٹ کام

۱۹۴۶ء میں امریکی کانگریس کے ایک وفد نے برصغیر ہند کا دورہ کیا۔ قائداعظم سے بھی اُن کی ملاقات ہوئی‘ جس کے بعد ایک بیان جاری ہوا کہ امریکہ اور آزاد پاکستان خطہ میں باہمی تعاون کریں گے اور ایک دوسرے کے مفادات کا تحفظ کریں گے۔ ہمارے وہ دانشور جو کمیونزم کی طرف رجحان رکھتے تھے‘ وہ الزام لگاتے ہیں کہ پاکستان تو اپنے جنم سے پہلے ہی امریکہ کے سپرد ہو گیا تھا۔ ہمارا سوال یہ ہے کہ جنگ عظیم دوم کے بعد جب دنیا بائی پولر ہوگئی تو دو عالمی قوتیں ابھر کر سامنے آئیں‘ ایک سوویت یونین جو بے خدا ریاست تھی اور مذہب سے نفرت اُس کی بنیاد میں شامل تھی‘ اُس سے اسلامی نظریہ کی بنیاد رکھنے والی ریاست کیسے دوستی اور محبت کا رشتہ قائم کرتی؟ لہٰذا مملکت خداداد پاکستان کا دوسری سپر پاور امریکہ کی طرف رجحان ہونا اور دوستی کا ہاتھ بڑھانا فطری‘ منطقی اور عقلی سطح پر بالکل درست تھا۔ بالکل آغاز میں شاید امریکہ بھی اس حوالہ سے مخلص تھا۔ اُس کا فوری مسئلہ کیپٹلزم کے مقابلے میں کمیونزم کو شکست دینا تھا۔

دنیا کی خاص طور پر عالمِ اسلام کی بدقسمتی کہ پاکستان کے قیام کے نو ماہ بعد اسرائیل نے جنم لیا۔ اُس کا دعویٰ بھی ایک نظریاتی ریاست کا تھا‘ اگرچہ حقیقت میں وہ ایک نسلی ریاست تھی‘ جیسا کہ بعد میں ثابت ہوا۔ قائداعظم نے اس ریاست کو مغرب کا ناجائز بچہ قرار دے دیا‘ کیونکہ مغرب مکمل طور پر پنجۂ یہود میں تھا۔ لیکن چونکہ جنگ عظیم دوم برپا ہی اس لیے کی گئی تھی کہ عالمی قوت کا مرکز یورپ سے امریکہ منتقل کیا جائے‘ کیونکہ یہودی وہاں پوری طرح پاؤں جما چکے تھے‘ لہٰذا امریکہ کا اس ناجائز بچے کو گود لینا لازم ٹھہر گیا۔ اُس وقت چونکہ امریکہ کی اصل پریشانی کمیونسٹ ریاست سوویت یونین تھی لہٰذا امریکہ نے کوشش کی کہ ان دونوں نظریاتی ریاستوں یعنی اسرائیل اور پاکستان میں ہم آہنگی بلکہ دوستی کا رشتہ قائم کر دیا جائے۔

یہاں اس بات کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ تقسیم ہند سے پہلے ہی برصغیر کے ہندوؤں میں خاص طور پر اُن کے دانشوروں میں کمیونزم کی طرف بڑی رغبت تھی۔ امریکہ سمجھ رہا تھا کہ اگر پاکستان کو

کمیونزم کے اثرات سے بچایا نہ گیا تو یہ سارا خطہ اُس کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ اُدھر چین بھی انقلاب کے دہانے پر کھڑا تھا اور وہاں بھی کیپٹلزم مخالف ہوا چل رہی تھی‘ لہٰذا امریکہ کا پاکستان کو اپنے ساتھ رکھنا لازم تھا‘ وگرنہ وہ سارے خطے سے آؤٹ ہو جاتا۔ اُدھر اسرائیل ایک قبضہ گروپ بن کر امریکہ پر اپنا تسلّط قائم کر چکا تھا۔ گویا امریکہ کی آنکھوں پر ایک ایسی عینک چڑھ چکی تھی کہ اسرائیل سے ہٹ کر اُس پر اندھا پن طاری ہو جاتا تھا۔ لہٰذا اسرائیل اور پاکستان کو ایک پیج پر لانے کی بھرپور اور پُرخلوص کوشش کی گئی۔ پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان کو امریکہ کے دورے کی دعوت دی گئی‘ وہاں اُن کا شاندار استقبال ہوا۔ یہودیوں نے لیاقت علی خان کو ایک زبردست عشائیہ دیا‘ جس میں یہودی نمائندے نے کھل کر پاکستان کو کہا کہ اگر وہ اسرائیل کو تسلیم کر لے تو یہودی پاکستان میں شہد اور دودھ کی نہریں بہا دیں گے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اُن کے لیے لیاقت علی خان کا جواب انتہائی مایوس کن تھا۔ لیاقت علی خان نے اُس عشائیہ میں ایک تاریخی جملہ بولا:

"Gentlemen! our souls are not for sale."

اس سے پہلے قائداعظم اسرائیل کے حوالے سے ایک فیصلہ کن بیان دے چکے تھے‘ لہٰذا یہودی اب پاکستان کو ایک دشمن ریاست کے طور پر دیکھنے لگے۔ البتہ چونکہ پاکستان امریکہ کی ایک ضرورت تھی لہٰذا مکمل طور پر پنجۂ یہود کی گرفت میں آ جانے والے امریکہ نے پاکستان کے حوالے سے ایک منافقانہ پالیسی پر عمل کرنا شروع کیا۔ یعنی پاکستان کو ظاہری اور اعلانیہ طور پر دوست کہو‘ اس پالیسی کو سپورٹ دینے کے لیے اُس کی اقتصادی اور عسکری سطح پر مدد بھی کرو‘ لیکن اصلاً اور عملاً اُس سے بدترین دشمنوں والا سلوک کیا جائے۔ یہاں سے ہماری یعنی پاکستان کے حکمرانوں کی غلطیوں کا آغاز ہوا اور بھرپور انداز سے ہوا‘ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ ہم نے اپنی حماقت سے اور دنیوی لالچ میں آ کر ملک وقوم کے خلاف بدترین جرائم کا ارتکاب کیا تو غلط نہ ہوگا۔

ہمارے حکمرانوں نے امریکی امداد سے گلچھرے اُڑائے اور ایسی پالیسیاں ترتیب دیں جن سے نہ صرف امریکہ کے مفادات کی تکمیل ہوئی بلکہ پاکستان کے مفادات کا بُری طرح قتلِ عام ہوا۔ امریکہ نے اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور پاکستان امریکہ کا دوست بننے کی بجائے امریکہ کا غلام بن گیا۔ قدرت نے پاکستان کو ایک اور چانس دیا اور یہ سنہری چانس تھا۔ وہ یوں کہ اس خطے میں چین جو پاکستان کا ہمسایہ بھی ہے اقتصادی اور عسکری لحاظ سے ایک عالمی قوت بن کر اُبھرا۔ مزید خوش قسمتی ہوئی کہ چین اور ہمارے دشمن بھارت کے درمیان کشیدگی پیدا

ہوگئی۔ ہمارے پاس سنہری موقع تھا کہ دشمن کے دشمن کے ساتھ مل کر اپنی پوزیشن کو مستحکم کرتے یعنی امریکہ سے دوری اختیار کر کے چین کو اپنا دوست بناتے۔ ہم نے یہ کام کیا' لیکن تاخیر سے اور نیم دلی سے۔ تقریباً سات آٹھ سال پہلے جب راحیل شریف پاکستان کے آرمی چیف تھے پاکستان نے امریکہ سے دور کھسکنا شروع کر دیا۔ پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ یہ کام بڑی آہستگی اور احتیاط سے کر رہی تھی کیونکہ مفادات دوطرفہ تھے۔ جس سطح اور جس انداز کے یہ مفادات تھے اُنہیں بالائے طاق رکھنے کے لیے جرأت کی ضرورت تھی۔ سابقہ حکومت نے اس میں تیزی دکھائی اور شاید ضرورت سے زیادہ تیزی دکھائی جو پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ کو ناگوار گزری۔ اُدھر امریکہ دیکھ رہا تھا کہ جغرافیائی لحاظ سے اہم' زبردست پروفیشنل فوج رکھنے والا اسلامی ایٹمی ملک اُس سے دور ہوتا جا رہا ہے' لہٰذا ایک رائے کے مطابق ناراض عسکری قیادت اور اپوزیشن سے مل کر پاکستان میں رجیم چینج کر دی گئی' اور وہ پاکستان جو ایک طویل عرصہ تک امریکہ سے منسلک رہنے کے بعد چند سالوں سے آزاد خارجہ پالیسی بنانے کی کوششوں میں تھا یکدم دوبارہ امریکہ کے چرنوں میں جا بیٹھا۔ ستم بالائے ستم پاکستان میں بارشوں اور سیلاب نے زبردست تباہی مچا دی۔ اب ہمارے حکمران کشکول اٹھائے در بدر پھر رہے ہیں اور امریکہ کے لیے سنہری موقع ہے کہ وہ پاکستان کا ناک رگڑے۔ چنانچہ اب امریکہ ایک دوسرا روپ دھار کر پاکستان میں داخل ہونا چاہتا ہے۔

پہلے ایک بات سمجھ لی جائے کہ ''سامراج'' کی اصطلاح دوسری جنگ عظیم کے بعد ایک نئے روپ میں سامنے آئی۔ نوآبادیات ایک ایسا سفاک اور استبدادی نظام ہوتا ہے جس میں ایک طاقت ور ملک چھوٹے اور کمزور علاقوں پر اپنا تسلّط قائم کرتا ہے اور ان کا سیاسی' معاشرتی اور ثقافتی استحصال کیا جاتا ہے۔ فوجی قوت اور سازشوں کے ذریعے مقامی اداروں اور ثقافت کو تباہ و برباد کر دیا جاتا ہے۔ یہ اس زیر تسلط خطے کو ''سونے کی چڑیا'' تصور کرتے ہیں۔ ایک ملک کا اپنی سرحدوں سے باہر جا کر دوسرے ملک کے اختیارات پر دخل اندازی کرنا ہی سامراجیت ہے۔ یہ دخل اندازی جغرافیائی' سیاسی یا اقتصادی طور پر ہو سکتی ہے۔ کسی ملک یا کسی خطے کو زیرِ تسلّط کر کے وہاں کے باشندوں کو مختلف حقوق سے محروم کرنا' اِس نظام کی اوّلین ظاہری صورت ہے۔ نوآبادیات کے ذریعہ سامراجیت کو وسعت دینے والا یہ نظام خوفناک اقتصادی' تہذیبی اور جغرافیائی مسائل پیدا کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب قوت کا مرکز امریکہ منتقل ہوا تو اُس نے کمال تندہی کے ساتھ اس نظام کو آگے بڑھانے کا بیڑا اُٹھایا۔ عسکری' اقتصادی' تہذیبی' جغرافیائی ہر طریقے سے اُس جدید نوآبادیاتی نظام کی بنیاد رکھی جو کہیں جلی اور کہیں خفی سطح پر آج دنیا بھر پر مسلط ہے۔

قصہ کوتاہ گزشتہ چند سالوں سے ہم نے اپنی خارجہ پالیسی کا رخ قدرے بدلا اور امریکہ کی بے چون وچرا غلامی سے نکلنے اور مشرق کی طرف دیکھنے کا سلسلہ شروع کیا' لیکن مبینہ رجیم چینج کے بعد ہمارا رخ ایک مرتبہ پھر امریکہ کی طرف ہو گیا۔ پہلے سینٹ کام کے کمانڈر نے ایک عرصہ بعد ہماری سول وعسکری قیادت کو اپنی ملاقاتوں کا شرف بخشا۔ پھر سیلاب متاثرین کی امداد کے لیے یو ایس ایڈ کے ساتھ مل کر متحدہ عرب امارات سے ۲۲ لاکھ ڈالر مالیت کی ترسیلات پاکستان پہنچانے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ یہ ایک الگ داستان ہے کہ یو ایس ایڈ جیسے ادارے امریکہ کی سامراجی پالیسی کو دنیا بھر میں کس طرح نافذ کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ امریکی فوج کی ایک بڑی شاخ یعنی سینٹ کام کو پاکستان کے عسکری دل یعنی نور خان ایئربیس چکلالہ میں رسائی کیوں دی جائے؟ کیا یو ایس ایڈ کی امداد سویلین طیاروں اور دیگر غیر عسکری ذرائع سے پاکستان نہیں پہنچائی جا سکتی؟ قطر نے بھی سیلاب زدگان کی امداد کے لیے ایئر برج قائم کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے اور اس مقصد کے لیے قطر ایئرویز کی خصوصی پروازوں کا استعمال کیا جائے گا۔ پھر یہ کہ آخر امریکہ کے دل میں پاکستان کے لیے آخر کون سی ایسی محبت جاگ اُٹھی کہ اچانک اُس نے ہمیں ایف سولہ طیاروں کی سروس اور دیکھ بھال کے لیے ۴۵ کروڑ ڈالر کی منظوری بھی دے دی اور اس اعلان کے تقریباً ایک ہفتہ بعد تک بھارت کی طرف سے کوئی اعتراض نہ آیا۔ پھر جب اعتراض کیا بھی گیا تو بھارت نے ڈونلڈ لو جو ایک خاص امریکی سفارت کار اور ڈیپ سٹیٹ کا نمائندہ ہے' کا ہی انتخاب کیوں کیا؟ کیا پاکستان کو کوئی پیغام دیا جا رہا ہے؟ امریکہ کے وزارت دفاع کے ترجمان کا یہ بیان کیا معنی رکھتا ہے کہ پاکستان کو ایف سولہ طیاروں کے لیے رقم اس لیے دی جا رہی ہے کہ تمام دہشت گردوں کے خلاف مکمل اور فوری کارروائی کی جائے۔

عربوں میں ایک کہاوت مشہور ہے کہ ایک بدو نے صحرا میں خیمہ لگایا اور اونٹ کو باہر ہی کھڑا کر کے سو گیا۔ رات کو اونٹ نے سردی کا بہانہ بنا کر پہلے اپنی گردن اور پھر اگلے پاؤں اندر کرنے کی اجازت چاہی جو بدو نے دے دی اور وہ بدو کو بہت مہنگی پڑی۔ اب امریکہ اپنی اگلی ٹانگیں اور دھڑ ہمارے خیمے میں داخل کرنے کے لیے بہانے بنا رہا ہے۔ ہم نے بھی امداد یا اقتدار کے لالچ میں اُسے یہ اجازت دے دی تو یہ ہمیں بھی اپنی سلامتی کے حوالے سے بڑی مہنگی پڑے گی۔ اب تو مخصوص لوگوں اور دانشوروں کو بھی رجیم چینج کا اصل مقصد سمجھ میں آ گیا ہوگا۔ یاد رہے اس جکڑ بندی سے مستقبل میں آسانی سے نکلا نہیں جا سکے گا۔

اللہ تعالیٰ پاکستان کو اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ آمین یا ربّ العالمین!

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُوْرَةُ التَّحْرِيْم

تمہیدی کلمات

جیسا کہ قبل ازیں سورۃ الطلاق کے تمہیدی کلمات میں بھی ذکر ہو چکا ہے‘ سورۃ الطلاق میں میاں بیوی کے اختلافات کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے جبکہ سورۃ التحریم کے آغاز میں عائلی زندگی کے دوسرے رخ کو نمایاں کیا گیا ہے۔ یعنی شوہر اپنی بیوی کی محبت یا اس کے جذبات کا پاس کرتے ہوئے کوئی ایسا کام کر بیٹھے جو شریعت میں جائز نہ ہو یا بیوی کی دلجوئی کے لیے کوئی ایسا کام نہ کرنے کی قسم کھا لے جو کہ شریعت کے مطابق جائز ہو۔ اگرچہ یہ مضمون یہاں پر حضور ﷺ کی ذات کے حوالے سے بیان ہوا ہے لیکن اصل مقصد اس سے اُمت کی تعلیم ہے۔ ظاہر ہے حضور ﷺ کے لیے تو یہ قطعاً ممکن نہیں تھا کہ آپ اپنی کسی بیوی کی دلجوئی کے لیے کوئی خلافِ شریعت عمل کرتے۔ البتہ آپ کی سیرت میں دو تین واقعات ایسے ملتے ہیں کہ آپ نے اپنی بیویوں کی دلجوئی کے لیے کوئی ایسی چیز نہ کھانے کی قسم کھائی تھی جو کہ آپ کے لیے حلال تھی۔ سورت کی ابتدائی آیات میں یہی موضوع زیر بحث آیا ہے۔

آیات ۱ تا ۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ
اَزْوَاجِكَ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ① قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ
اَيْمَانِكُمْ ۚ وَاللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ② وَاِذْ اَسَرَّ
النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ

اللّٰهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ ۚ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ
قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا ۭ قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ ③ اِنْ
تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ۚ وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ
اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ بَعْدَ
ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ ④ عَسٰى رَبُّهٗٓ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗٓ اَزْوَاجًا
خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰۗىِٕبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰۗىِٕحٰتٍ
ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا ⑤

آیت ۱ ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ﴾ ’’اے نبی (ﷺ)! آپ کیوں حرام ٹھہرا رہے ہیں (اپنے اوپر) وہ شے جو اللہ نے آپ کے لیے حلال کی ہے؟‘‘

﴿تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ۭ﴾ ’’آپ چاہتے ہیں اپنی بیویوں کی رضاجوئی!‘‘

﴿وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ①﴾ ’’اور اللہ بہت معاف کرنے والا‘ بہت رحم کرنے والا ہے۔‘‘

یعنی اللہ کو یہ بات پسند نہیں آئی‘ لیکن اُس نے معاف فرما دیا ہے۔

آیت ۲ ﴿قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ ۚ﴾ ’’اللہ نے تمہارے لیے اپنی قسموں کو کھولنے کا طریقہ مقرر کر دیا ہے۔‘‘

یعنی کفارہ دے کر قسموں کی پابندی سے نکلنے کا جو طریقہ سورۃ المائدۃ کی اس آیت میں بتایا گیا ہے:

﴿لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا
عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا
تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ۭ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ
فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ۭ وَاحْفَظُوْٓا
اَيْمَانَكُمْ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (٨٩)﴾

’’اللہ تعالیٰ مؤاخذہ نہیں کرے گا تم سے تمہاری ان قسموں میں جو لغو ہوتی ہیں لیکن وہ (ضرور) مؤاخذہ کرے گا تم سے ان قسموں پر جن کو تم نے پختہ کیا ہے‘ سو اس کا کفارہ

ہے کھانا کھلانا دس مساکین کو‘ اوسط درجے کا کھانا جیسا تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو‘ یا ان کو کپڑے پہنانا‘ یا کسی غلام کو آزاد کرنا۔ پھر جو کوئی اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو وہ تین دن کے روزے رکھے۔ یہ کفارہ ہے تمہاری قسموں کا جب تم قسم کھا (کر توڑ) بیٹھو۔ اور اپنی قسموں کی حفاظت کیا کرو۔ اس طرح اللہ تمہارے لیے اپنی آیات کو واضح فرما رہا ہے تاکہ تم شکر کرو۔‘‘

گویا آپ اپنی یہ قسم توڑ دیجیے اور اس ضمن میں کفارہ ادا کیجیے۔ بعض مترجمین نے یہاں ’’قَدْ فَرَضَ‘‘ کا ترجمہ ’’فرض کر دیا ہے‘‘ بھی کیا ہے اور اس کا یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ خلافِ شرع قسم کا توڑنا فرض ہے۔

﴿وَاللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝﴾ ’’اور اللہ تمہارا مددگار ہے‘ اور وہ سب کچھ جاننے والا‘ کمالِ حکمت والا ہے۔‘‘

آیت ۳ ﴿وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا ۚ﴾ ’’اور جب نبی (ﷺ) نے رازداری سے اپنی کسی زوجہ کو ایک بات بتائی۔‘‘

یہاں اس تفصیل میں جانے کا موقع نہیں کہ حضور ﷺ نے اپنی کسی زوجہ محترمہ ؓ کو راز کی کون سی بات بتائی تھی یا آپ ؐ نے کن حالات میں کس چیز کو استعمال نہ کرنے کی قسم کھائی تھی۔ تفاسیر میں ان آیات سے متعلق واقعات بڑی تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔ مزید معلومات کے لیے کسی بھی تفسیر سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال یہاں جو اصل بات سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ حضور ﷺ نے اپنی ایک زوجہ محترمہ ؓ کو ایک بات بتائی اور فرمایا کہ یہ میرا راز ہے کسی اور سے اس کا ذکر نہ کرنا۔

﴿فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ﴾ ’’تو جب اُس نے اس کو ظاہر کر دیا‘‘

عورتوں کے بارے میں عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ راز چھپانے کے حوالے سے طبعی طور پر کمزور ہوتی ہیں‘ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ یہ کمزوری بہت سے مَردوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ بہرحال ’’نہ ہر زن زن است و نہ ہر مرد مرد‘‘۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ کمزوری انسان میں طبعی طور پر پائی جاتی ہے اور اسی بنا پر اس کا صدور ازواجِ مطہرات ؓ سے بھی ہوا۔ چنانچہ جس زوجہ محترمہ ؓ کو وہ بات بتائی گئی تھی انہوں ؓ نے اس کا اظہار آپ ؐ کی کسی دوسری زوجہ محترمہ ؓ سے کر دیا۔

﴿وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ﴾ ’’اور اللہ نے اس بارے میں اُن ؐ کو مطلع کر دیا‘‘

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو آگاہ کر دیا کہ آپ ؐ کا وہ راز اب راز نہیں رہا۔

﴿عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ ۚ﴾ ’’تو نبی (ﷺ) نے اس پر کسی حد تک (اس بیوی کو) خبردار کیا اور کسی حد تک اس سے چشم پوشی کی۔‘‘

یعنی حضور ﷺ نے اس بات کا جزوی انداز سے ذکر فرما کر اپنی زوجہ محترمہ ؓ کو اشارتاً بتا دیا کہ مجھے اس راز کے افشا ہونے کا علم ہو چکا ہے۔

﴿فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ﴾ ’’تو جب آپ ؐ نے اسے یہ خبر دی‘‘

﴿قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا ۭ﴾ ’’اُس نے کہا کہ آپ ؐ کو یہ کس نے بتایا؟‘‘

عام میاں بیوی کے درمیان تو ایسے مکالمے میں کوئی حرج نہیں‘ لیکن یہاں معاملہ اللہ کے رسول ﷺ کا تھا۔ اس حوالے سے سورۃ الحجرات میں یہ تنبیہہ ہم پڑھ چکے ہیں: ﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۭ﴾ (آیت ۷) ’’تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تمہارے درمیان اللہ کے رسول ؐ ہیں‘‘۔ یعنی آپ ﷺ کے ساتھ تم لوگ دنیوی تعلقات اور رشتہ داریوں کی بنیاد پر معاملہ نہیں کر سکتے۔ چنانچہ اس معاملے میں محتاط طرزِ عمل تو یہی تھا کہ فوراً معذرت کر لی جاتی کہ حضور ﷺ مجھ سے واقعتاً غلطی ہو گئی‘ بس بے دھیانی میں بات میرے منہ سے نکل گئی......

﴿قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ ۝﴾ ’’آپ ؐ نے کہا: مجھے اُس نے بتایا ہے جو العلیم اور الخبیر ہے۔‘‘

مجھے اس اللہ نے بتایا ہے جو سب کچھ جاننے والا ہے اور ہر چیز سے باخبر ہے۔ اس جواب کے اسلوب اور انداز میں حضور ﷺ کے اظہارِ ناراضی کی جھلک محسوس کی جا سکتی ہے۔

آیت ۴ ﴿اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ۚ﴾ ’’اگر تم دونوں اللہ کی جناب میں توبہ کر لو تو (یہی تمہارے لیے بہتر ہے‘ کیونکہ) تمہارے دل تو مائل ہو ہی چکے ہیں۔‘‘

اس آیت کی تعبیر میں اہلِ تشیع کا نقطہ نظر یقیناً انتہا پسندانہ ہے‘ لیکن مقامِ حیرت ہے کہ ہمارے بعض مترجمین اور مفسّرین نے بھی انہی کی روش اختیار کی ہے۔ البتہ مولانا حمید الدین فراہی ؒ نے عربی اسلوب کو مدّنظر رکھتے ہوئے اس آیت کی جو وضاحت کی ہے میری رائے میں وہ بہت جامع اور بالکل درست ہے۔ اس حوالے سے میں ذاتی طور پر خود کو مولانا صاحب کا احسان مند مانتا

ہوں کہ ان کی اس تحریر کی بدولت مجھے قرآن کے اس مقام کا درست فہم اور شعور نصیب ہوا۔

اہل تشیع کے ہاں ﴿فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا﴾ کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے کہ تم دونوں کے دل ٹیڑھے ہو چکے ہیں۔ دراصل صَغَتْ ایسا لفظ ہے جس میں منفی اور مثبت دونوں معنی پائے جاتے ہیں۔ جیسے مَالَ اِلٰی کے معنی ہیں کسی کی طرف میلان یا توجہ ہونا جبکہ مَالَ عَنْ کے معنی ہیں کسی سے نفرت ہو جانا۔ اسی طرح لفظ رَغِبَ اِلٰی راغب ہونا' محبت کرنا اور رَغِبَ عَنْ ناپسند کرنا کے معنی دیتا ہے۔ صَغٰی کا معنی ہے جھک جانا' مائل ہو جانا۔ جب ستارے ڈوبنے لگتے ہیں تو عرب کہتے ہیں: صَغَتِ النُّجُوم۔ چنانچہ یہاں اس لفظ کا درست مفہوم مائل ہو جانا ہی ہے کہ اب تمہارے دل میں تو یہ بات آ ہی چکی ہے اور تمہارے دل تو خطا کو تسلیم کر ہی چکے ہیں' بس اب تم زبان سے بھی اس کا اعتراف کر لو۔ جیسے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی خطا کا احساس ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو اعتراف اور توبہ کے الفاظ بھی سکھا دیے: ﴿فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ﴾ (البقرۃ:۳۷) اور آپؑ نے سکھائے ہوئے طریقے سے توبہ کر لی۔

اس بارے میں عام رائے یہ ہے کہ مذکورہ بات حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بتائی تھی۔ چونکہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو دربارِ رسالت میں خصوصی مقام و مرتبہ حاصل تھا اسی نسبت سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا بھی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن میں ممتاز تھیں۔

﴿وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ﴾ ''اور اگر تم دونوں نے ان کے خلاف گٹھ جوڑ کر لیا ہے''

یہ بہت سخت الفاظ ہیں۔ قرآن مجید کے ایسے مقامات کو سمجھنے کے لیے بنیادی طور پر یہ اصول ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اَلرَّبُّ رَبٌّ وَاِنْ تَنَزَّلَ ' وَالْعَبْدُ عَبْدٌ وَاِنْ تَرَقّٰی۔ اور یہ بھی کہ جن کے مراتب جتنے بلند ہوں ان کا ہلکا سا سہو بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں قابلِ گرفت ہو جاتا ہے۔ جیسے عربی کا مقولہ ہے: حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَيِّئَاتُ الْمُقَرَّبِيْن یعنی عام لوگوں کے لیے جو کام بڑی نیکی کا سمجھا جائے گا ہو سکتا ہے کہ وہی کام اللہ تعالیٰ کے مقربین اولیاء اور محبوب بندوں کے لیے تقصیر قرار پائے اور ان کے مرتبہ کے اعتبار سے قابلِ گرفت شمار ہو جائے۔ اسی قاعدہ اور اصول کے تحت یہاں یہ سخت الفاظ آئے ہیں کہ اگر آپ لوگوں نے ہمارے رسول ﷺ کے خلاف کوئی متحدہ محاذ بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے تو سن لو:

﴿فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ ④﴾ ''اُنؐ کا پشت پناہ تو خود اللہ ہے اور جبریل اور تمام صالح مؤمنین' اور مزید برآں تمام فرشتے بھی اُنؐ کے مددگار ہیں۔''

لہٰذا بہتر تو یہ ہے کہ تم لوگ ہمارے رسولؐ کے ساتھ جو بھی معاملہ کرو اُن کے مقام و مرتبے کی مناسبت سے کیا کرو۔ تمہارا میاں بیوی کا رشتہ اپنی جگہ لیکن یہ حقیقت کسی لمحہ بھی نظرانداز نہیں ہونی چاہیے کہ وہ اللہ کے رسولؐ ہیں اور تم سب لوگ اُمتی ہو۔ تمہارا اُنؐ کے ساتھ بنیادی تعلق یہی ہے۔ اس تعلق کے مقابلے میں تمہارے باقی تمام رشتوں کی حیثیت ثانوی ہے۔ اس کے بعد آگے مزید سخت الفاظ آ رہے ہیں:

آیت ۵ ﴿عَسٰى رَبُّهٗٓ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗٓ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ﴾ ''بعید نہیں کہ اگر وہ تم سب کو طلاق دے دیں تو ان کا رب انہیں تم سے کہیں بہتر بیویاں عطا کر دے'' ﴿مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا ⑤﴾ ''اطاعت شعار' ایمان والیاں' فرمانبردار' توبہ کرنے والیاں' عبادت گزار' لذاتِ دنیوی سے بیگانہ' شوہر دیدہ بھی اور کنواری بھی۔''

ان الفاظ میں ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کی سیرت و کردار کی ایک جھلک بھی سامنے آتی ہے کہ تمہارے اندر جو یہ اوصاف ہیں کہ تم اطاعت شعار ہو' ایمان والیاں ہو' فرماں بردار ہو' توبہ کرنے والیاں ہو' زہد و قناعت کرنے والیاں ہو' ان پر تمہیں نازاں نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ان اوصاف کی حامل تم سے بہتر خواتین اپنے نبی مکرم ﷺ کے لیے ازواج کے طور پر فراہم کر سکتا ہے۔ یہاں یہ نکتہ بھی لائقِ توجہ ہے کہ مذکورہ اوصاف کے درمیان ''و'' بطور حرفِ عطف نہیں آیا' سوائے ایک ''و'' کے جو کہ آخر میں آیا ہے۔ یہ ایک غیر معمولی اسلوب ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خواتین ایسی شخصیات ہوں گی جن میں یہ تمام اوصاف بیک وقت موجود ہوں گے۔ سوائے آخری دو اوصاف کے کہ وہ دونوں اوصاف ایک شخصیت میں بیک وقت اکٹھے نہیں ہو سکتے' اس لیے ان کے درمیان میں ''و'' عطف آ گئی ہے —— ثَيِّبٰتٍ سے مراد ایسی عورتیں ہیں جنہیں نکاح کے بعد طلاق ہو گئی ہو یا وہ بیوہ ہو گئی ہوں۔ یہاں ضمنی طور پر یہ بھی جان لیجیے کہ سوائے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے باقی تمام ازواجِ مطہراتؓ ثَيِّبٰت ہی کی حیثیت سے

حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے نکاح میں آئیں۔

ان ابتدائی پانچ آیات کا تعلق عائلی زندگی سے ہے۔ اس مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ میاں بیوی کے درمیان روزمرہ زندگی کے معاملات کو حدِّ اعتدال میں رہنا چاہیے۔ ایک دوسرے کے حقوق کا خیال بھی رکھا جائے اور دوسرے کے حوالے سے اپنے فرائض کو بھی نظر انداز نہ کیا جائے‘ لیکن اللہ تعالیٰ کے حقوق کو تمام معاملات پر فوقیت دی جائے۔ اگر میاں بیوی میں اختلافات پیدا ہو جائیں اور اصلاح کی کوئی صورت نہ رہے تو قواعد وضوابط کو مدِّنظر رکھتے ہوئے شرافت کے ساتھ علیحدگی اختیار کر لی جائے۔ لیکن اگر گھر کے ماحول میں محبّت و یگانگت کا رنگ غالب ہو تو بھی محتاط رہا جائے کہ کہیں بے جا محبّت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حدود نہ ٹوٹنے پائیں اور ایسا نہ ہو کہ بیوی بچوں کی محبّت انسان کو غلط راستے پر لے جائے۔

اس کے بعد کی تین آیات کا تعلق خصوصی طور پر مَردوں سے ہے اور یہ دراصل سورۃ الحدید ہی کے مضمون کا تسلسل ہے جو یہاں اس گروپ کی آخری سورت کے اختتام پر آ گیا ہے۔

آیات ۶ تا ۸

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ
وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ
وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝۶ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَعْتَذِرُوا
الْيَوْمَ ؕ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۷ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ؕ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ
سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ يَوْمَ لَا
يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ
اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ
اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۸

آیت ۶ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا﴾ ’’اے اہلِ ایمان! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو اُس آگ سے‘‘

اس سے پہلے سورۃ التغابن میں اہلِ ایمان کو اُن کے اہل وعیال کے بارے میں اس طرح متنبہ کیا گیا ہے: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ﴾ (آیت ۱۴) ’’اے ایمان کے دعوے دارو! تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں تمہارے دشمن ہیں‘ پس ان سے بچ کر رہو‘‘۔ سورۃ التغابن کے اس حکم کے تحت اہلِ ایمان کو منفی انداز میں متنبہ کیا گیا ہے‘ جبکہ آیت زیر مطالعہ میں انہیں ان کے اہل وعیال کے بارے میں مثبت طور پر خبردار کیا جا رہا ہے کہ بحیثیت شوہر اپنی بیویوں کو اور بحیثیت باپ اپنی اولاد کو دین کے راستے پر ڈالنا تمہاری ذِمّہ داری ہے۔ یہ مت سمجھو کہ ان کے حوالے سے تمہاری ذِمّہ داری صرف ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے کی حد تک ہے‘ بلکہ ایک مؤمن کی حیثیت سے اپنے اہل وعیال کے حوالے سے تمہارا پہلا فرض یہ ہے کہ تم انہیں جہنّم کی آگ سے بچانے کی فکر کرو۔ اس کے لیے ہر وہ طریقہ اختیار کرنے کی کوشش کرو جس سے ان کے قلوب واذہان میں دین کی سمجھ بوجھ‘ اللہ کا تقویٰ اور آخرت کی فکر پیدا ہو جائے تاکہ تمہارے ساتھ ساتھ وہ بھی جہنّم کی اس آگ سے بچ جائیں:

﴿وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ﴾ ’’جس کا ایندھن بنیں گے انسان اور پتھر‘‘

﴿عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ﴾ ’’اس پر بڑے تُندخُو‘ بہت سخت دل فرشتے مامور ہیں‘‘

وہ فرشتے مجرموں کو جہنّم میں جلتا دیکھ کر ان پر رحم نہیں کھائیں گے‘ اور نہ ہی وہ ان کے نالہ و شیون سے متاثر ہوں گے۔ تو کیا ہم ناز و نعم میں پالے ہوئے اپنے لاڈلوں کو جہنّم کا ایندھن بننے کے لیے ان سخت دل فرشتوں کے سپرد کرنا چاہتے ہیں؟ بہرحال ہم میں سے ہر ایک کو اس زاویے سے اپنی ترجیحات کا سنجیدگی سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ کیا ہم اپنے اہل وعیال کو جنّت کی طرف لے جا رہے ہیں یا جہنّم کا راستہ دکھا رہے ہیں؟ اپنے بہترین وسائل خرچ کر کے اپنی اولاد کو ہم جو تعلیم دلوا رہے ہیں کیا وہ ان کو دین کی طرف راغب کرنے والی ہے یا ان کے دلوں میں دین سے بغاوت کے بیج بونے والی ہے؟ اگر تو ہم اپنے اہل وعیال کو اچھے مسلمان بنانے کی کوشش نہیں کر رہے اور ان کے لیے ایسی تعلیم وتربیت کا اہتمام نہیں کر رہے جو انہیں دین کی طرف راغب کرنے اور فکرِ آخرت سے آشنا کرنے کا باعث بنے تو ہمیں جان لینا چاہیے کہ ہم محبّت کے نام پر ان سے عداوت کر رہے ہیں۔

﴿لَّا يَعۡصُوۡنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمۡ﴾ ’’اللہ ان کو جو حکم دے گا وہ فرشتے اس کی نافرمانی نہیں کریں گے‘‘

اللہ تعالیٰ جس کو جیسا عذاب دینے کا حکم دے گا وہ فرشتے اسے ویسا ہی عذاب دیں گے۔ کسی کے رونے دھونے کی وجہ سے اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتیں گے۔

﴿وَيَفۡعَلُوۡنَ مَا يُؤۡمَرُوۡنَ ۝۶﴾ ’’اور وہ وہی کریں گے جس کا انہیں حکم دیا جائے گا۔‘‘

آیت ۷ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لَا تَعۡتَذِرُوا الۡيَوۡمَ ؕ﴾ ’’(اُس دن کہہ دیا جائے گا:) اے کافرو! آج تم عذر مت پیش کرو۔‘‘

آج تم معذرتیں نہ تراشو‘ بہانے مت بناؤ!

﴿اِنَّمَا تُجۡزَوۡنَ مَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ۝۷﴾ ’’آج تمہیں بدلے میں وہی کچھ دیا جا رہا ہے جو تم عمل کر کے لائے ہو۔‘‘

آیت ۸ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا تُوۡبُوۡۤا اِلَى اللّٰهِ تَوۡبَةً نَّصُوۡحًا ؕ﴾ ’’اے اہلِ ایمان! توبہ کرو اللہ کی جناب میں خالص توبہ۔‘‘

یہ آیت اپنے مضمون اور اسلوب کے اعتبار سے زیر مطالعہ سورتوں کے گروپ میں منفرد حیثیت کی حامل ہے۔ اس میں پُل صراط کے اس ماحول کی جھلک بھی دکھائی گئی ہے جس کی تفصیل سورۃ الحدید میں آئی ہے۔ اس آیت کے ابتدائی حصے میں اہلِ ایمان کو توبہ سے متعلق جو حکم دیا گیا ہے اس حکم میں بہت جامعیت ہے۔ اس سے مراد صرف کسی ایک برے عمل کی توبہ نہیں کہ کوئی شخص شراب نوشی سے توبہ کر لے یا کوئی رشوت خوری سے باز آ جائے‘ بلکہ اس سے مراد غفلت کی زندگی اور معصیت کی روش سے توبہ ہے۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ یہ زندگی کا رخ بدلنے کا حکم ہے‘ کہ اے ایمان کے دعوے دارو! ذرا اپنی زندگی کے شب و روز پر غور تو کرو کہ تمہارا رخ کس طرف ہے؟ تمہاری زندگی کے سفر کی منزل کیا ہے؟ تم محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے نقشِ قدم پر چل رہے ہو یا کسی اور کی پیروی کر رہے ہو؟ ﴿فَاَيۡنَ تَذۡهَبُوۡنَ ۝۲۶﴾ (التکویر) —— تو اے اللہ کے بندو! اپنی زندگی کے شب و روز اور معمولات کا جائزہ لو‘ اپنی دوڑ دھوپ اور اپنی ترجیحات پر غور کرو۔ پھر اگر تم محسوس کرو کہ تم غلط رخ پر جا رہے ہو تو اپنے بڑھتے ہوئے قدم فوراً روک لو ﴿فَفِرُّوۡۤا اِلَى اللّٰهِ ؕ﴾

(الذاریات: ۵۰) اور کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر اپنے رب کی طرف پلٹ آؤ! تمہارے پلٹنے کے لیے اللہ کی رحمت کا دروازہ اس وقت تک کھلا ہے جب تک تمہاری موت کے آثار ظاہر نہیں ہوتے۔ چنانچہ ابھی موقع ہے کہ اس کے حضور سجدہ ریز ہو کر اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کرو‘ زندگی کے جو ماہ و سال غفلت کی نذر ہو گئے ہیں ان پر اشکِ ندامت بہاؤ‘ صدقِ دل اور اخلاصِ نیت سے معافی مانگو اور غلط روش کو ترک کرنے کے بعد زندگی کا سفر از سرِنو شروع کرو۔

یہاں پر یہ نکتہ بھی سمجھ لیجیے کہ سفرِ زندگی کی سمت درست کرنے کے لیے فرائضِ دینی کا درست فہم اور ادراک بھی ضروری ہے۔ ظاہر ہے دین صرف نمازیں پڑھنے اور رمضان کے روزے رکھنے ہی کا نام نہیں‘ بلکہ ایک بندۂ مؤمن کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی معاشرت اور معیشت کو بھی ’’مسلمان‘‘ کرے۔ پھر یہ کہ جو ہدایت اسے نصیب ہوئی ہے اسے دوسروں تک پہنچانے کا اہتمام کرے اور کسی جماعت میں شامل ہو کر دین کے سب سے اہم فرض کی ادائیگی یعنی باطل نظام کے خاتمے اور اللہ تعالیٰ کی حکومت کے قیام کی جدّوجُہد میں سرگرمِ عمل ہو جائے۔ اس کے لیے انقلابِ نبویؐ کے منہج کو سمجھنا اور اس منہج کی پیروی کرنا بہت ضروری ہے۔ آج ہماری جدّوجُہد میں حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرام ؓ کی محنت اور کوشش کی سی کیفیت تو پیدا نہیں ہو سکتی کہ ع ’’وہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا!‘‘ لیکن ہمیں آپؐ کے منہج پر چلنے کی کوشش تو کرنی چاہیے۔ ادنیٰ سے ادنیٰ درجے میں سہی آپؐ کی تحریک کے ساتھ اپنی جدّوجُہد کی کچھ نہ کچھ مماثلت اور مشابہت تو پیدا کرنی چاہیے۔ چنانچہ ایک ایک گھر اور ایک ایک فرد تک دعوت پہنچانے کا اہتمام‘ دعوت پر لبیک کہنے والوں کی تنظیم و تربیت کا انتظام‘ صبر و مصابرت کی حکمت عملی‘ جیسے ضروری مراحل ہمیں اسی طریقے سے طے کرنے کی کوشش کرنی چاہیے جس طریقے سے خود حضور ﷺ نے یہ مراحل طے فرمائے تھے۔ اس موضوع پر مزید معلومات کے لیے میری کتاب ’’منہج انقلابِ نبویؐ‘‘ اور اسی عنوان سے تقاریر کی ریکارڈنگ سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

﴿عَسٰى رَبُّكُمۡ اَنۡ يُّكَفِّرَ عَنۡكُمۡ سَيِّاٰتِكُمۡ﴾ ’’امید ہے تمہارا رب تم سے تمہاری بُرائیوں کو دور کر دے گا‘‘

تمہارے توبہ کرنے سے اللہ تعالیٰ تمہارے نامہ اعمال سے تمام دھبے دھو ڈالے گا اور تمہارے دامنِ کردار کے تمام داغ صاف کر دے گا۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے: ((اَلتَّائِبُ

مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَا ذَنْبَ لَہٗ))[1] کہ گناہ سے توبہ کرنے والا ایسے ہو جاتا ہے جیسے اس نے وہ گناہ کبھی کیا ہی نہ ہو۔

﴿وَیُدۡخِلَکُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ ۙ﴾ ’’اور تمہیں داخل کرے گا ایسے باغات میں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی‘‘

﴿یَوۡمَ لَا یُخۡزِی اللّٰہُ النَّبِیَّ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَہٗ ۚ﴾ ’’جس دن اللہ اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اور ان کے ساتھ ایمان لانے والوں کو رسوا نہیں کرے گا۔‘‘

﴿نُوۡرُہُمۡ یَسۡعٰی بَیۡنَ اَیۡدِیۡہِمۡ وَبِاَیۡمَانِہِمۡ﴾ ’’(اُس دن) ان کا نُور دوڑتا ہوگا ان کے سامنے اور ان کے داہنی طرف‘‘

یہ مضمون اس سے پہلے انہی الفاظ میں سورۃ الحدید کی آیت ۱۲ میں بھی آ چکا ہے۔ نُورِ ایمان ان کے سامنے ہوگا جبکہ اعمالِ صالحہ کا نُور داہنی طرف ہوگا۔

﴿یَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَاۤ اَتۡمِمۡ لَنَا نُوۡرَنَا﴾ ’’وہ کہتے ہوں گے: اے ہمارے رب! ہمارے لیے ہمارے نُور کو کامل کر دے‘‘

﴿وَاغۡفِرۡ لَنَا ۚ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۸﴾﴾ ’’اور تُو ہمیں بخش دے‘ یقیناً تُو ہر شے پر قادر ہے۔‘‘

ہر بندۂ مؤمن کا نُور اس کے ایمان اور اعمالِ صالحہ کی مناسبت سے ہوگا۔ حضرت قتادہؒ سے مرسلاً روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ’’کسی کا نُور اتنا تیز ہوگا کہ مدینہ سے عدن تک کی مسافت کے برابر فاصلے تک پہنچ رہا ہوگا اور کسی کا نُور مدینہ سے صنعاء تک‘ اور کسی کا اس سے کم‘ یہاں تک کہ کوئی مؤمن ایسا بھی ہوگا جس کا نُور اُس کے قدموں سے آگے نہ بڑھے گا۔‘‘ (ابن جریر)[2]

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان کے مطابق تصوّر کریں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور دوسرے

۱۔ سنن ابن ماجه‘ کتاب الزهد‘ باب ذکر التوبة- صحیح الجامع للالبانی‘ ح:۳۰۰۸۔ راوی: عبداللہ بن مسعود وابوسعید الخدری رضی اللہ عنہما۔ السنن الکبریٰ للبیهقی: ۱۵۴/۱۰۔

۲۔ اس ضمن میں ایک حدیث میں یہ الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نُور کا کیا عالَم ہوگا۔ بہرحال ہم جیسے مسلمانوں کو اُس دن اگر ٹارچ کی روشنی جیسا نُور بھی مل جائے تو غنیمت ہے۔ لیکن ہمارے لیے یہاں توجّہ طلب نکتہ یہ ہے کہ اس دن کچھ لوگوں کا نُور کم کیوں ہوگا۔ یقیناً وہ ایسے لوگ ہوں گے جن کے ایمان میں کسی پہلو سے کوئی کمزوری رہ گئی ہوگی اور اعمال میں کوتاہیاں سرزد ہوئی ہوں گی۔ یقیناً انہوں نے اپنی استعداد کو‘ اپنے مال کو اور اپنی خداداد صلاحیتوں کو بچا بچا کر رکھا ہوگا اور اللہ کے راستے میں انہیں اس حد تک خرچ نہیں کیا ہوگا جس حد تک خرچ کرنے کے وہ مکلّف تھے۔ اس حوالے سے علامہ اقبال کی یہ نصیحت ہمیں حرزِ جاں بنا لینی چاہیے: ؎

تُو بچا بچا کے نہ رکھ اسے‘ ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں!

بہرحال پُل صراط کے کٹھن اور نازک راستے پر جن اہلِ ایمان کا نُور کم ہوگا وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں گے کہ اے اللہ! تُو اپنے فضل اور اپنی شانِ غفاری سے ہماری کوتاہیوں کو ڈھانپ لے اور ہمارے نُور کو بھی مکمل فرما دے۔

آیت ۹

یٰۤاَیُّہَا النَّبِیُّ جَاہِدِ الۡکُفَّارَ وَالۡمُنٰفِقِیۡنَ وَاغۡلُظۡ عَلَیۡہِمۡ ؕ وَمَاۡوٰىہُمۡ جَہَنَّمُ ؕ وَبِئۡسَ الۡمَصِیۡرُ ﴿۹﴾

((... فَمِنْهُمْ مَنْ يُعْطٰى نُوْرَهٗ مِثْلَ الْجَبَلِ الْعَظِيْمِ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ‘ وَمِنْهُمْ مَنْ يُعْطٰى نُوْرَهٗ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِکَ ‘ وَمِنْهُمْ مَنْ يُعْطٰى مِثْلَ النَّخْلَةِ بِيَدِهٖ‘ وَمِنْهُمْ مَنْ يُعْطٰى اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِکَ‘ حَتّٰى يَكُوْنَ آخِرُهُمْ يُعْطٰى نُوْرَهٗ عَلٰى اِبْهَامِ قَدَمِهٖ يُضِيْءُ مَرَّةً وَيُطْفِأُ مَرَّةً...)) [الترغیب والترهیب للمنذری: ۲۹۶/۴‘ راوی: عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ۔ امام البانی نے اسے صحیح کہا ہے۔]

’’...... پس ان میں سے بعض کو اتنا نُور عطا کیا جائے گا جو بہت بڑے پہاڑ کی مانند ہوگا اور وہ ان کے دائیں طرف دوڑتا ہوگا‘ اور کسی کو اس سے کم نُور عطا کیا جائے گا۔ اور ان میں کسی کو اتنا نُور عطا کیا جائے گا گویا اس کے ہاتھ میں کھجور کا درخت ہے اور کسی کو اس سے کم نُور عطا ہوگا۔ حتیٰ کہ ان میں سے سب سے آخری شخص کا حال یہ ہوگا کہ اس کو بس اتنا سا نُور عطا کیا جائے گا جو اس کے پاؤں کے انگوٹھے پر ہوگا‘ جو کبھی جلتا اور کبھی بجھتا ہوگا......‘‘ (حاشیہ از مرتب)

آیت ۹ ﴿یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِیْنَ وَ اغْلُظْ عَلَیْهِمْ ؕ﴾ ’’اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم)! جہاد کیجیے کافروں سے بھی اور منافقوں سے بھی اور ان پر سختی کیجیے۔‘‘

یہ آیت جوں کی توں سورۃ التوبہ میں (آیت ۷۳ کے طور پر) بھی آ چکی ہے۔ منافقین چونکہ بظاہر کلمہ گو اور قانونی لحاظ سے مسلمان تھے‘ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے مسلمانوں جیسا سلوک روا رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نرم مزاجی کی وجہ سے ان کی بہت سی شرارتوں کو نظرانداز بھی فرماتے رہتے تھے۔ چنانچہ اپنی مسلسل سازشوں پر جوابدہی نہ ہونے کی وجہ سے ان کے حوصلے بہت بڑھ گئے تھے۔ یہاں تک کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں گستاخانہ جملے بھی کستے رہتے تھے۔ مثلاً کہتے: ﴿هُوَ اُذُنٌ﴾ (التوبۃ:۶۱) کہ آپؐ تو نرے کان ہیں۔ ہر بات سن لیتے ہیں‘ سمجھتے کچھ بھی نہیں (معاذ اللہ!)۔ یہی وجہ ہے کہ اس آیت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان لوگوں پر سختی کرنے کا کہا جا رہا ہے۔

﴿وَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِیْرُ ۝۹﴾ ’’ان کا ٹھکانہ جہنم ہے‘ اور وہ بہت بُرا ٹھکانہ ہے۔‘‘

آیات ۱۰ تا ۱۲

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّ امْرَاَتَ لُوْطٍ ؕ
كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَیْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَیْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ یُغْنِیَا
عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا وَّ قِیْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِیْنَ ۝۱۰
وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ۘ اِذْ قَالَتْ
رَبِّ ابْنِ لِیْ عِنْدَكَ بَیْتًا فِی الْجَنَّةِ وَ نَجِّنِیْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَ عَمَلِهٖ
وَ نَجِّنِیْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۝۱۱ وَ مَرْیَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِیْۤ
اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِیْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَ صَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا
وَ كُتُبِهٖ وَ كَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِیْنَ ۝۱۲

ان آیات میں عورتوں کا معاملہ ایک اور پہلو سے زیر بحث آ رہا ہے۔ واضح رہے کہ ان دونوں سورتوں (الطلاق اور التحریم) کی ایک مشترک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان دونوں میں عورتوں

کے معاملات بیان ہوئے ہیں۔ چنانچہ اب عورتوں پر واضح کیا جا رہا ہے کہ وہ خود کو اپنے شوہروں کے تابع سمجھتے ہوئے آخرت کے حساب سے نچنت نہ ہو جائیں۔ اسلام میں عورت اور مرد کا درجہ انسان ہونے کی حیثیت سے برابر ہے۔ لہٰذا عورتیں اپنے دین و ایمان اور اعمال و فرائض کی خود ذمہ دار ہیں۔ اگر ان کا ایمان درست ہوگا اور اعمالِ صالحہ کا پلڑا بھاری ہوگا تبھی نجات کی کوئی صورت بنے گی۔ ان کے شوہر خواہ اللہ کے کتنے ہی برگزیدہ بندے کیوں نہ ہوں اس معاملے میں وہ ان کے کچھ کام نہیں آ سکیں گے۔ اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے ان آیات میں چار خواتین کی مثالیں دی گئی ہیں:

آیت ۱۰ ﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّ امْرَاَتَ لُوْطٍ ؕ﴾ ’’اللہ نے مثال بیان کی ہے کافروں کے لیے نوحؑ کی بیوی اور لوطؑ کی بیوی کی۔‘‘

﴿كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَیْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَیْنِ﴾ ’’وہ دونوں ہمارے دو بہت صالح بندوں کے عقد میں تھیں‘‘

﴿فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ یُغْنِیَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا﴾ ’’تو انہوں نے ان سے خیانت کی‘ تو وہ دونوں اللہ کے مقابل میں ان کے کچھ بھی کام نہ آ سکے‘‘

وہ جلیل القدر پیغمبر علیہما السلام اپنی بیویوں کو اللہ کے عذاب سے نہ تو دنیا میں بچا سکے اور نہ ہی آخرت میں بچا سکیں گے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی سیلاب میں غرق ہوگئی اور حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی بھی اپنی قوم کے لوگوں کے ساتھ پتھراؤ کے عذاب سے ہلاک ہوئی۔ واضح رہے کہ یہاں جس خیانت کا ذکر ہوا ہے اس سے مراد کردار کی خیانت نہیں ہے‘ اس لیے کہ کسی نبیؑ کی بیوی کبھی بدچلن اور بدکار نہیں رہی ہے۔ ان کی خیانت اور بے وفائی دراصل دین کے معاملے میں تھی کہ وہ دونوں اپنے شوہروں کی جاسوسی کرتی تھیں اور ان کے راز اپنی قوم کے لوگوں تک پہنچاتی تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک شادی شدہ عورت کی عصمت اُس کے شوہر کی عزّت و ناموس ہے جس کی حفاظت کرنا شوہر کی طرف سے اس پر فرض ہے‘ لیکن اس کے علاوہ ایک بیوی اپنے شوہر کے رازوں اور اس کے مال وغیرہ کی محافظ بھی ہوتی ہے۔ سورۃ النساء کی آیت ۳۴ میں نیک اور مثالی بیویوں کی جو صفات بیان کی گئی ہیں ان میں ایک صفت حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ بھی ہے۔ اس کا مفہوم یہی ہے کہ نیک بیویاں اپنے شوہروں کی غیر حاضری میں ان کے گھر بار اور حقوق کی

محافظ ہوتی ہیں۔ اب ظاہر ہے اس حفاظت میں شوہر کی عزّت و ناموس کے ساتھ ساتھ اس کے مال اور اس کے رازوں وغیرہ کی حفاظت بھی شامل ہے۔ چنانچہ یہاں خیانت سے صرف عزّت و ناموس ہی کی خیانت مراد لینا درست نہیں۔

﴿وَّقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ ۝۱۰﴾ ''اور (آخرت میں) کہہ دیا جائے گا کہ تم دونوں داخل ہو جاؤ آگ میں دوسرے سب داخل ہونے والوں کے ساتھ۔''

ان دو عبرت انگیز مثالوں سے یہ حقیقت واضح ہو جانی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے وہ اولوالعزم پیغمبرؑ جنہوں نے ساڑھے نو سو سال اللہ تعالیٰ کے پیغام کی دعوت میں صَرف کیے وہ اگر اپنی بیوی کو بُرے انجام سے نہیں بچا سکے تو اور کون ہوگا جو اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے کسی عزیز رشتے دار کی سفارش کر سکے گا؟ نبی اکرم ﷺ نے اپنی دعوت کے آغاز میں قبیلہ قریش بالخصوص اپنے قریبی اعزّہ واقارب کو جمع کر کے فرمایا تھا:

((يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ ! اشْتَرُوْا اَنْفُسَكُمْ مِنَ اللّٰهِ لَا اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا، يَا بَنِيْ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ! لَا اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا، يَا عَبَّاسَ بْنَ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ! لَا اُغْنِيْ عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا، يَا صَفِيَّةُ عَمَّةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ! لَا اُغْنِيْ عَنْكِ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا، يَا فَاطِمَةُ بِنْتَ رَسُوْلِ اللّٰهِ! سَلِيْنِيْ بِمَا شِئْتِ لَا اُغْنِيْ عَنْكِ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا))[۳]

''اے قریش کے لوگو! اپنے آپ کو اللہ (کی گرفت) سے بچانے کی کوشش کرو، مَیں اللہ کے مقابلہ میں تمہارے کچھ بھی کام نہ آ سکوں گا۔ اے بنی عبدالمطلب! مَیں اللہ کے مقابلہ میں تمہارے کچھ بھی کام نہ آ سکوں گا۔ اے عباس بن عبدالمطلب! مَیں اللہ کے مقابلہ میں تمہارے کچھ بھی کام نہ آ سکوں گا۔ اے صفیہ! اللہ کے رسول کی پھوپھی! مَیں اللہ کے مقابلہ میں تمہارے کچھ بھی کام نہ آ سکوں گا۔ اے فاطمہ! اللہ کے رسولؐ کی بیٹی! تم مجھ سے (میرے مال میں سے) جو چاہو طلب کر لو لیکن مَیں اللہ کے مقابلہ میں تمہارے کچھ بھی کام نہ آ سکوں گا۔''

ایک روایت میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں:

۳۔ صحیح البخاری' کتاب الوصایا' باب ھل یدخل النساء والولد فی الاقارب' ح:۲۷۵۳ و ۴۷۷۱۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب فی قولہ تعالیٰ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ' ح:۲۰۶ (واللفظ لہ)

((يَا فَاطِمَةُ بِنْتَ مُحَمَّدٍ (ﷺ) اَنْقِذِيْ نَفْسَكِ مِنَ النَّارِ، فَاِنِّيْ لَا اَمْلِكُ لَكِ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا))[۴]

''اے محمد (ﷺ) کی لختِ جگر فاطمہؓ! اپنے آپ کو آگ سے بچاؤ' کیونکہ مجھے تمہارے بارے میں اللہ کے ہاں کوئی اختیار نہیں ہوگا۔''

آیت ۱۱ ﴿وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ۘ﴾ ''اور اہلِ ایمان (خواتین) کے لیے اللہ نے مثال بیان کی ہے فرعون کی بیوی کی۔''

اُن کا نام حضرت آسیہؓ (بنت مزاحم) بیان کیا جاتا ہے۔ دریائے نیل سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا صندوق ان ہی نے نکالا تھا اور حضرت موسیٰؑ کی پرورش کا اہتمام کیا تھا۔ بعد میں وہ مسلمان ہو گئی تھیں اور ہمیشہ فرعون کے مقابلے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف داری کیا کرتی تھیں۔ جب فرعون کو پتا چل گیا کہ آسیہ اُسے خدا نہیں مانتی اور موسیٰؑ پر ایمان لا چکی ہے تو اُس نے ان پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ ڈالے۔

﴿اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ﴾ ''جب اُس نے کہا: اے میرے پروردگار! تُو میرے لیے بنا دے اپنے پاس ایک گھر جنّت میں''

﴿وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ﴾ ''اور مجھے نجات دے دے فرعون سے بھی اور اس کے عمل سے بھی''

﴿وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝۱۱﴾ ''اور مجھے اس ظالم قوم سے (جلد از جلد) چھٹکارا دلا دے۔''

حضرت آسیہ رضی اللہ عنہا کی اس دعا سے ان کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیت کا نقشہ سامنے آتا ہے۔ ظاہر ہے وہ ایک عظیم الشان سلطنت کے مطلق العنان فرمانروا کی بیوی تھیں۔ اس حیثیت سے انہیں عزّت' دولت' شہرت اور محلات میں ہر طرح کی آسائشیں حاصل تھیں۔ لیکن ان کے ایمان اور اللہ تعالیٰ سے ان کی محبّت کی کیفیت یہ تھی کہ وہ اپنے شوہر اور اس کے کافرانہ اعمال سے بیزار ہو کر موت کی آرزومند تھیں۔

۴۔ صحیح مسلم کتاب الایمان' باب فی قولہ تعالیٰ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ' ح:۲۰۴۔ وصحیح ابن حبان' ح:۶۴۶ (واللفظ لہ)

ان دومثالوں میں دوانتہاؤں کی تصویر دکھادی گئی ہے۔یعنی ایک طرف بہترین شوہروں کے ہاں بدترین انجام والی بیویاں ہیں اور دوسری طرف ایک بدترین مرد کے گھر میں بہترین سیرت وکردار کی حامل بیوی ہے۔ظاہر ہے حضرت آسیہؒ قیامت کے دن حضرت مریمؑ‘ حضرت خدیجہ‘ حضرت عائشہ اور حضرت فاطمہ ؓ جیسی عظیم مراتب کی حامل خواتین میں شامل ہوں گی۔

آیت ۱۲ ﴿وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا﴾ ’’اور عمران کی بیٹی مریمؑ جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی‘‘

یہ تیسری مثال ایسی خاتون کی ہے جو خود بھی نیک تھیں اور ان کی تربیت بھی انتہائی پاکیزہ ماحول میں ہوئی: ﴿وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا﴾ (آل عمران:۳۷)۔یعنی انہوں نے اللہ کے جلیل القدر پیغمبر حضرت زکریاعلیہ السلام کی آغوشِ محبت میں پرورش پائی اور یوں ان کی سیرت نُورٌعلیٰ نُور کی مثال بن گئی۔

﴿فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا﴾ ’’تو ہم نے اس میں اپنی روح میں سے پھونکا‘‘

﴿وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ﴾ ’’اور اُس نے تصدیق کی اپنے رب کی تمام باتوں کی اور اُس کی کتابوں کی‘‘

حضرت مریم سلام علیہا کو وحی کے ذریعے فرشتے جو کچھ بتاتے رہے انہوں نے وہ سب باتیں دل وجان سے تسلیم کیں۔مثلاً یہ کہ اللہ نے تمہیں دنیا بھر کی عورتوں میں سے چُن لیا ہے اور یہ کہ اللہ کے حکم سے تمہارے ہاں بیٹا ہوگا۔اسی طرح حضرت مریم نے زبور‘ تورات اور عہد نامہ قدیم سمیت تمام الہامی کتب اور صحائف کی تصدیق بھی کی۔

﴿وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ ۝۱۲﴾ ’’اور وہ بہت ہی فرمانبرداروں میں سے تھیں۔‘‘

ان تین مثالوں کے ذریعے خواتین کے حوالے سے تین ممکنہ صورتیں بیان کی گئی ہیں‘ یعنی بہترین شوہر کے ہاں بدترین بیوی‘ بدترین شوہر کے ہاں بہترین بیوی‘ اور بہترین ماحول میں بہترین خاتون۔ چوتھی ممکنہ صورت یہ ہوسکتی ہے کہ شوہر بھی بدطینت ہو اور اس کی بیوی بھی بدطینت ہو۔یعنی میاں بیوی دونوں کا ظاہر و باطن ﴿ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ﴾ (النور:۴۰) کا نقشہ پیش کرتا ہو اور فیصلہ کرنا مشکل ہو جائے کہ ان دونوں میں کون زیادہ بدطینت اور بدسرشت ہے۔اس ممکنہ صورت کی مثال سورۃ اللھب میں ابولہب اور اُس کی بیوی (اُمّ جمیل) کی بیان ہوئی ہے۔ ۞۞۞

اپنے آپ اور اپنے اہلِ خانہ کو آگ سے بچاؤ!

اخذ وترتیب: سعادت محمود

گزشتہ مضمون میں قرآن حکیم کے حوالے سے اہلِ ایمان کے لیے ایک اعزاز کا ذکر تھا کہ اُن کی وہ اولاد جو اپنے عمل کے لحاظ سے اگرچہ اُس مرتبے کی مستحق نہ ہوگی جو اُن کے آباء کو اُن کے بہتر ایمان وعمل کی بنا پر حاصل ہوگا‘ پھر بھی یہ اولاد اپنے آباء کے ساتھ ملادی جائے گی۔

انہی آیات میں اس اعزاز کے پانے والوں کی ایک صفت جو اللہ تعالیٰ نے بیان کی ہے وہ بہت ہی قابلِ توجہ ہے:

﴿وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ۝۲۵ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ ۝۲۶﴾ (الطور)

’’یہ (جنّت میں پہنچ جانے والے) لوگ آپس میں ایک دوسرے سے (دنیا میں گزرے ہوئے) حالات پوچھیں گے۔ اور کہیں گے کہ ہم پہلے (دنیا میں) اپنے گھر والوں میں (اللہ سے) ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرتے تھے۔‘‘

سورۃ الحاقۃ میں ارشاد فرمایا:

﴿فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۙ فَيَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ ۝۱۹ اِنِّيْ ظَنَنْتُ اَنِّيْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ ۝۲۰﴾

’’اُس وقت جس کا نامۂ اعمال اُس کے سیدھے ہاتھ میں دیا جائے گا‘ وہ کہے گا لو دیکھو! پڑھو میرا اعمال نامہ۔ مَیں سمجھتا (یقین رکھتا) تھا کہ مجھے ضرور اپنا حساب ملنے والا ہے۔‘‘

اس کے برعکس جس کو اُس کا نامۂ اعمال بائیں ہاتھ میں یا پیٹھ پیچھے دیا جائے گا‘ اُس کے بارے میں فرمایا:

﴿اِنَّهٗ كَانَ فِيْٓ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ۝۱۳ اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ ۝۱۴ بَلٰٓى ۚ اِنَّ رَبَّهٗ

كَانَ بِهٖ بَصِيْرًا ﴿١٥﴾ (الانشقاق)

"وہ اپنے گھر والوں میں مگن تھا۔ اُس نے سمجھا تھا کہ اُسے کبھی (اپنے ربّ کی طرف) پلٹنا ہی نہیں ہے۔ کیوں نہیں! اُس کا ربّ اُس (کے کرتوتوں) کو دیکھ رہا تھا۔"

ان آیات میں بڑی وضاحت سے دو کردار سامنے آتے ہیں۔ پہلے وہ لوگ جنہیں اُن کا نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اور وہ جنّت میں داخل کیے جائیں گے‘ اُن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ اپنے گھر والوں میں مگن ہو کر اللہ سے غافل نہیں ہو جاتے تھے بلکہ اس ماحول میں بھی اللہ سے ڈرتے رہتے تھے اور انہیں یہ احساس رہتا تھا کہ انہیں ایک دن اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔

دوسرے وہ لوگ جنہیں اُن کا نامۂ اعمال بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اور وہ جہنّم میں داخل کیے جائیں گے‘ اُن کے بارے میں فرمایا کہ وہ اپنے گھر والوں میں مگن ہوتے تھے تو اللہ تعالیٰ سے غافل ہو جاتے تھے۔ اور انہیں یہ احساس نہیں رہتا تھا کہ اُنہیں ایک دن اپنے ربّ کے پاس حاضر ہونا ہے اور اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو خبردار کیا ہے اور فرمایا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿٩﴾﴾ (المنفقون)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تمہارے مال اور تمہاری اولادیں تم کو اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں۔ اور جو لوگ ایسا کریں وہی خسارے میں رہنے والے ہیں۔"

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٤﴾﴾ (التغابن)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں‘ اُن سے ہوشیار رہو۔ اور اگر تم عفو و درگزر سے کام لو اور معاف کر دو تو اللہ غفور و رحیم ہے۔"

احادیث میں اہلِ ایمان کے لیے ایک اور اعزاز کا ذکر ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوسعید خدری ؓ سے مروی طویل روایت ہے‘ جس میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا:

"اس کے بعد جہنّم کے اوپر پُل (صراط) رکھا جائے گا۔ اور شفاعت شروع ہو گی تو لوگ کہیں گے: اے اللہ! ہمیں بچا‘ اے اللہ! ہمیں بچا۔ لوگوں نے کہا اے اللہ کے رسولؐ یہ پُل کیسا ہو گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ ایک پھسلنے کا مقام ہو گا۔ وہاں آنکڑے ہوں گے اور کانٹے جیسے ملکِ نجد میں ایک کانٹا ہوتا ہے جس کو سعدان (ٹیڑھے منہ والا) کہتے ہیں۔ اہلِ ایمان اُس پر سے پار ہوں گے۔ بعض پلک جھپکنے میں‘ بعض بجلی کی طرح‘ بعض پرندے کی طرح‘ بعض تیز گھوڑوں کی طرح اور بعض اُونٹ کی طرح۔ کچھ لوگ پُل (صراط) سے سلامتی کے ساتھ گزر جائیں گے۔ کچھ لوگوں کو خراشیں آئیں گی لیکن وہ بھی پار ہو جائیں گے۔ (ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ایک آدمی پُل صراط کو گھسٹ کر عبور کرے گا) اور کچھ لوگ جہنّم میں گر جائیں گے۔"

تصور کریں اُن کی خوشی کا جو پُل صراط سے سلامتی کے ساتھ گزر جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی پُل صراط سے صحیح سلامت گزر جانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین! پھر ارشاد فرمایا:

"اہلِ ایمان جب اپنے آپ کو جہنّم کی آگ سے محفوظ پائیں گے تو قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے‘ تم میں سے کوئی بھی اپنے حق کے لیے اتنا جھگڑنے والا نہیں ہے جتنا وہ اپنے اُن بھائیوں کے لیے جو جہنّم میں گر چکے ہوں گے‘ اللہ سے جھگڑنے والے ہوں گے۔ وہ کہیں گے: اے ہمارے ربّ! یہ ہمارے ساتھ روزے رکھتے تھے‘ ہمارے ساتھ نماز پڑھتے تھے اور ہمارے ساتھ حج کرتے تھے۔ (اللہ) کہے گا اچھا جاؤ اور ہر اُس شخص کو نارِ جہنّم سے باہر نکال کے لے آؤ جس کو تم جانتے ہو۔"

کیا آپ اُن لوگوں کی خوشی کا اندازہ کر سکتے ہیں‘ جنہیں پتہ چلے گا کہ وہ اُن میں سے جو جہنّم میں گر چکے ہیں‘ اپنے جاننے والوں کو نکال سکتے ہیں۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان جھگڑنے والوں میں شامل کر دے اور اپنے اُن جاننے والوں کو جو جہنّم میں گر چکے ہوں گے نکالنے کی توفیق دے۔ آمین مزید ارشاد فرمایا:

"اللہ تعالیٰ آگ کو گنہگاروں کے چہروں کو جلانے سے روک دے گا۔ (تاکہ اہلِ ایمان انہیں پہچان سکیں) اور مؤمنین بہت سے آدمیوں کو جہنّم سے نکال لیں گے۔"

اس کے بعد مزید تفصیل ہے جس کو مذکورہ حدیث میں دیکھا جا سکتا ہے۔

یہاں ایک بات تو یہ قابلِ غور ہے کہ اہلِ ایمان اتنے نازک موقع پر بھی اپنے جاننے والوں کو یاد رکھیں گے اور اُن کے لیے اللہ سے دُعا کریں گے۔ اور دوسرے اللہ تعالیٰ بھی اپنے بندوں

کی دُعا قبول کرتے ہوئے اُنہیں یہ اعزاز بخشے گا کہ وہ جسے جانتے ہوں اُسے جہنّم سے نکال لیں۔

گزشتہ مضمون میں جس خوبصورت منظر کا ذکر آیا تھا وہ تصویر کا ایک رخ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے کلامِ مجید میں اس منظر (تصویر) کے دوسرے رُخ کا بھی ذکر کیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ ۚ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۳﴾ (الممتحنة)

''قیامت کے دن نہ تمہاری رشتہ داریاں تمہارے کام آئیں گی نہ تمہاری اولاد۔ اُس روز اللہ تمہارے درمیان جدائی ڈال دے گا' اور وہی تمہارے اعمال کا دیکھنے والا ہے۔''

﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۭ وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۭ﴾ (فاطر:۱۸)

''کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔ اور اگر کوئی لدا ہوا نفس اپنا بوجھ اٹھانے کے لیے پکارے گا تو اس کے بار کا ایک ادنیٰ حصّہ بھی بٹانے کے لیے کوئی نہ آئے گا چاہے وہ قریب ترین رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔''

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا يَوْمًا لَّا يَجْزِيْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ ۡ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْـــًٔا ۭ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۣ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۳۳﴾ (لقمٰن)

''لوگو! بچو اپنے رب کے غضب سے اور ڈرو اُس دن سے جبکہ کوئی باپ اپنے بیٹے کی طرف سے بدلہ نہ دے گا' اور نہ کوئی بیٹا ہی اپنے باپ کی طرف سے کچھ بدلہ دینے والا ہوگا۔ فی الواقع اللہ کا وعدہ سچا ہے' پس یہ دنیا کی زندگی تمہیں دھوکے میں نہ ڈالے' اور نہ وہ بڑا دھوکہ باز تم کو اللہ کے معاملے میں دھوکا دینے پائے۔''

ان آیات میں تو صرف اتنا ذکر ہے کہ وہ ایک دوسرے کے کام نہ آسکیں گے۔ ایک اور مقام پر اس سے بھی سخت کیفیت کا ذکر ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاِذَا جَاۗءَتِ الصَّاۗخَّةُ ۳۳ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ۳۴ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ۳۵ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ۳۶ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَىِٕذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ۳۷﴾ (عبس)

''آخرکار جب وہ کان بہرے کر دینے والی آواز بلند ہوگی۔ اُس روز آدمی اپنے بھائی اور اپنی ماں اور اپنے باپ اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھاگے گا۔ ان میں سے ہر

شخص پر اُس دن ایسا وقت آپڑے گا کہ اُسے اپنے سوا کسی کا ہوش نہ ہوگا۔''

اور پھر اس سے بھی بڑھ کر کہ نہ صرف ایک دوسرے سے دور بھاگیں گے بلکہ اپنی نجات کے بدلے ان سب قریبی رشتہ داروں کو فدیہ میں دینے کو تیار ہوں گے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَاۗءُ كَالْمُهْلِ ۸ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ۹ وَلَا يَسْـَٔــلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا ۱۰ يُّبَصَّرُوْنَهُمْ ۭ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِىِٕذٍۢ بِبَنِيْهِ ۱۱ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ ۱۲ وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُـــْٔوِيْهِ ۱۳ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ ثُمَّ يُنْجِيْهِ ۱۴﴾ (المعارج)

''جس روز آسمان پگھلی ہوئی چاندی کی طرح ہو جائے گا۔ اور پہاڑ رنگ برنگ کے دُھنکے ہوئے اون جیسے ہو جائیں گے۔ اور کوئی جگری دوست اپنے جگری دوست کو نہ پوچھے گا۔ حالانکہ وہ ایک دوسرے کو دکھائے جائیں گے۔ مجرم چاہے گا کہ اس دن کے عذاب سے بچنے کے لیے اپنی اولاد کو' اپنی بیوی کو' اپنے بھائی کو' اپنے قریب ترین خاندان کو جو اسے پناہ دینے والا تھا اور روئے زمین کے سب لوگوں کو فدیہ میں دے دے' پھر یہ تدبیر اُسے (عذاب سے) نجات دلا دے۔''

اللہ تعالیٰ مجھے' آپ کو اور تمام اہلِ ایمان کو ایسے اعمال کرنے کی توفیق دے کہ ہم اس بُرے انجام سے بچ سکیں۔ آمین!

اسی تناظر میں ایک اور منظر ملاحظہ فرمائیں۔ سورۃ الحدید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَاۗءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ۭ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ۭ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ۱۳ يُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَاۗءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۱۴ فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ ۭ هِيَ مَوْلٰىكُمْ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۱۵﴾

''اُس روز مُنافق مَردوں اور مُنافق عورتوں کا حال یہ ہوگا کہ وہ مومنوں سے کہیں گے ذرا ہماری طرف دیکھو تا کہ ہم بھی تمہارے نور سے کچھ فائدہ اٹھائیں۔ مگر اُن سے کہا

جائے گا پیچھے پلٹ جاؤ اور اپنا نور کہیں اور تلاش کرو! پھر اُن کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہوگا۔ اُس دروازے کے اندر رحمت ہی رحمت ہوگی اور باہر عذاب ہی عذاب۔ وہ مومنوں سے پکار پکار کر کہیں گے کیا ہم (دنیا میں) تمہارے ساتھ نہ (رہتے) تھے؟ مومن جواب دیں گے ہاں' مگر تم نے خود اپنے آپ کو فتنے میں ڈالا' موقع پرستی کی' شک میں پڑے رہے' اور جھوٹی توقعات تمہیں فریب دیتی رہیں' یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ آ گیا' اور آخر وقت تک وہ بڑا دھوکے باز (شیطان) تمہیں اللہ کے معاملہ میں دھوکا دیتا رہا۔ لہٰذا آج نہ تم سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا اور نہ اُن لوگوں سے جنہوں نے کھلم کھلا کفر کیا تھا۔ تمہارا ٹھکانا جہنّم ہے' وہی تمہاری خبر گیری کرنے والی ہے' اور یہ بدترین انجام ہے۔''

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے سورۃ التحریم میں ارشاد فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا قُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ وَاَهۡلِیۡکُمۡ نَارًا وَّقُوۡدُهَا النَّاسُ
وَالۡحِجَارَۃُ عَلَیۡهَا مَلٰٓئِکَۃٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا یَعۡصُوۡنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمۡ
وَیَفۡعَلُوۡنَ مَا یُؤۡمَرُوۡنَ ۝۶ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَا تَعۡتَذِرُوا الۡیَوۡمَ ؕ
اِنَّمَا تُجۡزَوۡنَ مَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ۝۷﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اُس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے' جس پر نہایت تُند خو اور سخت گیر فرشتے مقرر ہوں گے جو کبھی اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم بھی انہیں دیا جاتا ہے اسے بجا لاتے ہیں۔ (جنہوں نے ایمان لانے کے بعد بھی اپنے آپ کو آگ سے بچانے کا سامان نہیں کیا ہوگا اُن سے کہا جائے گا:) اے کافرو! آج معذرتیں پیش نہ کرو' تمہیں تو ویسا ہی بدلہ دیا جا رہا ہے جیسے تم عمل کر رہے تھے۔''

پھر اہلِ ایمان کو جو ایمان کے تقاضوں کو پورا نہیں کر رہے اور غفلت میں پڑے ہوئے ہیں' کہا جا رہا ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا تُوۡبُوۡۤا اِلَی اللّٰهِ تَوۡبَۃً نَّصُوۡحًا ؕ عَسٰی رَبُّکُمۡ اَنۡ
یُّکَفِّرَ عَنۡکُمۡ سَیِّاٰتِکُمۡ وَیُدۡخِلَکُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ۙ
یَوۡمَ لَا یُخۡزِی اللّٰهُ النَّبِیَّ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ ۚ نُوۡرُهُمۡ یَسۡعٰی بَیۡنَ
اَیۡدِیۡهِمۡ وَبِاَیۡمَانِهِمۡ یَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَاۤ اَتۡمِمۡ لَنَا نُوۡرَنَا وَاغۡفِرۡ لَنَا ۚ اِنَّکَ

عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ۝۸ یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الۡکُفَّارَ وَالۡمُنٰفِقِیۡنَ وَاغۡلُظۡ
عَلَیۡهِمۡ ؕ وَمَاۡوٰىهُمۡ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئۡسَ الۡمَصِیۡرُ ۝۹﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کے حضور توبہ کرو' خالص توبہ۔ بعید نہیں کہ اللہ تمہاری بُرائیاں تم سے دور کر دے اور تمہیں ایسی جنتوں میں داخل فرما دے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ یہ وہ دن ہوگا جب اللہ اپنے نبی (ﷺ) کو اور اُن لوگوں کو جو اُس کے ساتھ ایمان لائے ہیں رُسوا نہ کرے گا۔ اُن کا نور اُن کے آگے آگے اور اُن کے دائیں جانب دوڑ رہا ہوگا اور وہ کہہ رہے ہوں گے کہ اے ہمارے ربّ! ہمارا نور ہمارے لیے مکمل کر دے اور ہم سے درگزر فرما' یقیناً تُو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ اے نبی (ﷺ)! کُفّار اور منافقین سے جہاد کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ۔ ان کا ٹھکانا جہنّم ہے' اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے۔''

اسی طرح سورۃ الحدید کی مذکورہ بالا آیات کے بعد والی آیات میں اہلِ ایمان کو جھنجوڑا گیا ہے کہ اگر تم اب تک غفلت میں پڑے رہے ہو تو اب بھی وقت ہے کہ خوابِ غفلت سے جاگو اور اپنے ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے کمر بستہ ہو جاؤ۔ بہت ہی قابلِ غور' قابلِ توجّہ اور فکر کرنے والی آیت ہے۔ خطاب کُفّار اور منافقین سے نہیں اہلِ ایمان سے ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اَلَمۡ یَاۡنِ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡ تَخۡشَعَ قُلُوۡبُهُمۡ لِذِکۡرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ
الۡحَقِّ ۙ وَلَا یَکُوۡنُوۡا کَالَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ مِنۡ قَبۡلُ فَطَالَ عَلَیۡهِمُ
الۡاَمَدُ فَقَسَتۡ قُلُوۡبُهُمۡ ؕ وَکَثِیۡرٌ مِّنۡهُمۡ فٰسِقُوۡنَ ۝۱۶ اِعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ یُحۡیِ
الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا ؕ قَدۡ بَیَّنَّا لَکُمُ الۡاٰیٰتِ لَعَلَّکُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ۝۱۷﴾

''کیا ایمان لانے والوں کے لیے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ اُن کے دل اللہ کے ذکر سے پگھلیں اور اُس کے نازل کردہ حق کے آگے جھک جائیں؟ اور وہ اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جنہیں پہلے کتاب دی گئی تھی' پھر ایک لمبی مدت اُن پر گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے۔ اور آج ان میں سے اکثر فاسق بنے ہوئے ہیں۔ خوب جان لو کہ اللہ زمین کو اُس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے۔ ہم نے نشانیاں تم کو صاف صاف دکھا دی ہیں' شاید کہ تم عقل سے کام لو!''

اللہ تعالیٰ مجھے' آپ کو اور تمام اہلِ ایمان کو اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

❁❁❁

فکر و عمل کی تعمیر کا نبویؐ طریق

راحیل گوہر صدیقی*

عام طور سے انسان کے فکر و عمل کے دو زاویے ہوتے ہیں۔ ایک میں وہ اپنے معاش اور دیگر مادی ضروریات کو پیش نظر رکھتا ہے جبکہ دوسری جانب اسے اپنے معبودِ حقیقی سے بھی ربط و تعلق استوار رکھنا پڑتا ہے۔ اس دوگانہ تعلق میں اسے یکسانیت اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے تہذیب کی میزان برابر رکھنی پڑتی ہے، ورنہ جھکاؤ کسی ایک طرف بھی ہو گیا تو توازن بگڑ جائے گا۔ ایک طرف اس کا زیادہ جھکاؤ مادہ پرستی، الحاد، خواہشات و جذبات کی غلامی پر منتج ہو گا تو دوسری جانب بہت زیادہ میلان اسے رہبانیت، ترکِ دنیا اور نفس کُشی کی راہوں پر لے جائے گا۔ یہ دونوں ہی صورتیں انسانی شخصیت کو غیر متوازن کر دیتی ہیں۔ روحانی اور مادی حوالے سے اس کشمکش نے انسان کے وجود میں ایک ہیجان اور تناؤ کی سی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ یوں اس کے وہ باطنی جواہر مضمحل ہو گئے ہیں جو اس کی شخصیت کی صورت گری کرنے، اس کو فکری ترفع دینے اور معاشرے میں ایک ذمہ دار اور فعال کردار ادا کرنے کا باعث ہوتے ہیں۔

انسان کی اس باطنی شکست و ریخت کے مظاہر اس کی زندگی کے اجتماعی اور انفرادی گوشوں میں عیاں ہوتے رہتے ہیں۔ انسان کو اس کے نفس کے تقاضوں اور مغربی تہذیب کے جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری کی چمک دمک نے احساسِ کمتری، ذہنی انتشار، قلبی سکون سے محرومی، اخلاقی بگاڑ، تشکیک و تردّد اور انحراف و اختلاف میں ایسا الجھا دیا ہے کہ نظروں کے سامنے پھیلی ہوئی دھند کے سوا اسے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ یہ دھند دراصل انسان کی بصیرت کے شفاف آئینے پر پڑی وہ گرد ہے جو اس کے فکر و عمل کی کج روی اور فہم و فراست کی غیر فعالیت کی بنا پر آئینے کو بے نور کر دیتی ہے۔

زندگی میں عظمت بصیرت سے حاصل ہوتی ہے جبکہ بصیرت کا حصول عرفان کے بغیر ممکن

* Email:raheelgoher5@gmail.com

نہیں۔ کوئی بھی نظریہ یا فلسفہ زندگی کو سمجھنے کے نتیجے میں معرضِ وجود میں آتا ہے۔ انسان نے جب سے غور و فکر کرنا سیکھا ہے، وہ اس کائنات کے رموز اور اس کی معنویت سمجھنے میں غلطاں و پیچاں ہے۔ اسی فہم و تدبر کی ادھیڑ بن کے سبب دنیا میں علم و دانش کا ارتقا ہوا اور مختلف فلسفہ ہائے مذہب وجود میں آئے۔ مذہب زندگی کی گرہیں کھولنے کا بہترین آلہ ہے، لیکن انسانی ذہن کی عیاریوں اور فلسفیانہ موشگافیوں نے اسے الجھا دیا ہے۔ بقول اکبر الٰہ آبادی ؎

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں!

فلسفیانہ افکار انسان کو زندگی کے حقائق سے دور کر کے اس کے فکر و عمل میں شکوک و شبہات کا بیج بو دیتے ہیں۔ اسباب میں اپنی فکر لگانا یا اس سے دست بردار ہو جانا آپ کی قدرت و اختیار میں نہیں۔ اسباب میں بار بار غور و خوض کرنے سے نفس پر کچھ ایسا رنگ چڑھ جاتا ہے کہ پھر وہ اسباب ہی کا بندہ بن جاتا ہے۔ وہ اپنے قابو سے باہر ہو جاتا ہے اور اس بے بسی کا اس کے نفس کو بھی علم نہیں ہوتا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ اسباب پر نظر نہ ڈالی جائے کہ پھر اس کے جال سے نکلنا دشوار ہو جائے گا۔ اسباب کی فکر میں پڑنے اور اسی پر بھروسا کرنے سے ایمان دل سے نکل جاتا ہے اور انسان کفر کی حدوں کو چھونے لگتا ہے۔ وہ اسباب کے سمندر ہی میں غوطہ زنی کرتا رہتا ہے، لیکن پھر بھی ناکام و نامراد ہی رہتا ہے۔ ؎

تمام عمر سہاروں پہ آس رہتی ہے
تمام عمر سہارے فریب دیتے ہیں

دنیا میں ہر نظام اپنا ایک بنیادی فلسفہ اور تصور رکھتا ہے جس کی بنیاد پر وہ زندگی کی تمام تفصیلات طے کرتا ہے۔ اسی تصورِ حیات کی بنیاد پر وہ کچھ لوگوں کو اپنے سے قریب اور کچھ کو اپنے سے الگ قرار دیتا ہے۔ اسلام نے اپنے نظام کی بنیاد کے طور پر جغرافیائی وحدت، علاقائی قربت، نسلی عصبیت، لسانی یک جہتی یا ایسے ہی دوسرے تعصبات کو قبول نہیں کیا۔ اس نے صرف ایک چیز کو اپنے نظام کی بنیاد مانا اور اعلان کیا کہ یہ کائنات کی سب سے بڑی اور اوّلین حقیقت ہے، جس پر تمام انسانوں کو متحد کر کے ایک بین الاقوامی نظام اور بین الانسانی نظریہ مرتب کیا جاسکتا ہے۔

چنانچہ صرف نظریہ اور عقیدہ ہی کی بنیاد پر انسانوں کو بلاامتیازِ رنگ و نسل متحد کیا جاسکتا ہے۔

دوسری بنیادوں کے برعکس کوئی بھی عقیدہ اور نظریہ انسان اپنی آزاد مرضی اور شعوری ارادے سے اپناتا ہے۔ غلط نظریات سے تائب ہو کر وہ جب چاہے درست نظریہ اختیار کر سکتا ہے۔ رنگ‘ نسل اور جائے پیدائش انسان کے اپنے اختیار سے باہر کی چیزیں ہیں اس لیے ان کی بنیاد پر اسلام کے بین الاقوامی قانون کی عمارت استوار نہیں کی جا سکتی۔

انسان کے ترکِ واختیار اور ردّ وقبول کی صلاحیت میں بھی اللہ تعالیٰ کی کوئی نہ کوئی مصلحت وحکمت پوشیدہ ہوتی ہے۔ انسان کو جن استعدادات اور طبعی قوتوں سے نوازا گیا ہے ان کے پیچھے بھی کوئی خاص مقصد کارفرما ہے۔ وہ یہ کہ انسان اپنی فطری صلاحیتوں کو اللہ تعالیٰ کی منشا اور اس کی رضامندی کے عین مطابق استعمال کرے۔ زندگی اس ڈھب سے گزارے جس میں اُس کا خالق راضی ہو۔ اپنی ذات کی نفی کر دینا‘ اپنے منہ زور نفس کی لگام کو کھینچ کر رکھنا اور راضی برضا رہنا ربّ تعالیٰ کی خوشنودی کے حصول کے ذرائع ہیں۔

بعثتِ انبیاء ورسل ؑ اور ان کے فرائضِ منصبی

سوال یہ ہے کہ بندہ اپنے ربّ کی مرضی و منشا کو کیسے معلوم کرے! خالق ومخلوق کے درمیان پڑے حجابات کو اٹھانا انسان کے قبضہ قدرت میں نہیں ہے۔ یہاں وہ لاچار و بے بس ہے۔ یہ تمام چیزیں تو مابعد الطبیعیات کے اسرار و رموز ہیں جبکہ اس سوال کے جواب کا حصول تو خود انسان کی اپنی فلاح ونجات کے لیے بھی اہمیت کا حامل ہے۔ اگر کسی کو یہ معلوم ہی نہ ہو کہ جس منزل کی طرف وہ رواں دواں ہے‘ اس تک پہنچنے کا راستہ کون سا ہے تو وہ کبھی اپنی منزل پر نہیں پہنچ پائے گا۔ انجانے راستوں کے نشیب وفراز مسافر کو ان گھاٹیوں میں لے جا سکتے ہیں جو اس کی ہلاکت وبربادی کا ٹھکانہ ثابت ہوں گی۔ ایسے میں اسے کسی ایسی رہنمائی اور سواء السبیل کی ضرورت ہوتی ہے جو صحیح سمت کی طرف اس کے رخ کو موڑ سکے۔ چونکہ انسان کی نظر پیکرِ محسوس کی عادی ہے اس لیے ہدایت ورہنمائی کے لیے اسے کسی اپنے ہی جیسے انسان کا وجود بطورِ نمونہ چاہیے تھا۔ لہٰذا خالقِ کائنات نے انبیاء اور رسولوں ؊ کا سلسلہ شروع کیا‘ جس کی آخری کڑی یا رشد وہدایت کی مضبوط عمارت کی آخری اینٹ خاتم الانبیاء والمرسلین محمد عربی ﷺ کو بنایا گیا۔ سورۃ الجمعہ میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝۲﴾

’’وہی (اللہ) تو ہے جس نے اَن پڑھوں میں‘ انہی میں سے (یعنی محمد ﷺ کو) پیغمبر بنا کر بھیجا‘ جو ان کے سامنے اس کی آیات پڑھتے‘ ان کا تزکیہ کرتے اور اللہ کی کتاب اور دانائی سکھاتے ہیں۔ اور اس سے پہلے یہ تو صریح گمراہی میں تھے۔‘‘

حق کی راہ سے بھٹکے ہوئے یا شعور وآگہی سے محروم انسانوں کے کردار وعمل کی درستی کے لیے یہ چار صفات رسول مکرم ﷺ کے فرائضِ منصبی میں شامل ہیں۔ اس کی اہمیت کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ سورۃ البقرہ میں دو مقامات پر اور سورۂ آلِ عمران میں بھی اس کا اعادہ کیا گیا ہے۔

انبیاء کرام ؊ کی بعثت کا اصل مقصد یہی رہا ہے کہ بندوں کا تعلق اللہ تعالیٰ سے مضبوط کیا جائے۔ اپنے قول وفعل سے دنیا اور آخرت کی حقیقتوں کو واضح اور مبرہن کیا جائے۔ قرآن مجید میں خصوصی توجہ دلائی گئی کہ رسول ﷺ کی پیروی اور اطاعت کرو کیوں کہ رسول ؑ کی اطاعت ہی دراصل اللہ کی اطاعت ہے۔ اللہ ربّ العالمین نے انبیاء ورسل ؊ کو اپنا نائب بنا کر اس کارزارِ حیات میں بھیجا ہے۔ چنانچہ یہ اُنؑ کی ذمہ داری ہے کہ وہ انسانوں کے ذہنی اشکالات اور فکری اُلجھنوں کو حکمت وموعظت کے ساتھ دور کریں۔ ان کو یہ آگہی دیں کہ خالقِ کائنات کا اس محیّر العقول کائنات سے ربط وتعلق کیا ہے۔ ایک بندہ ہونے کی حیثیت سے اللہ سے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ اس وسیع وعریض کائنات میں انسان کس مقام ومرتبہ پر فائز ہے؟ انسانوں کے مابین حقوق وفرائض کے حدود کا پیمانہ کیا ہے؟ اخلاقی ضابطے‘ سماجی تعلقات‘ تمدنی تقاضے اور خیر و شر کے خارجی اور داخلی داعیات کے معیارات کیا ہیں؟ ان سارے امور کی پردہ کشائی رسولوں کا فرضِ منصبی ہے۔

انسان کی کردار سازی کا اصل راز ہی یہ ہے کہ اس کے اندر روحِ ربانی کی بالیدگی‘ نشوونما اور ارتقا کی منازل درجہ بدرجہ طے ہوتی چلی جائیں۔ قرآن کریم میں ربّ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ۝۱۹﴾ (الانشقاق)

’’تم یقیناً درجہ بدرجہ آگے بڑھو گے۔‘‘

اسی امر کے پیشِ نظر انبیاء ورسل ؊ کو مبعوث کیا گیا اور انہیں انسانی نفوس کے تزکیہ اور ان کے

آئینہ روح کو فسق و فجور کی گرد سے صاف کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ چنانچہ عقلی موشگافیوں‘ منطق و فلسفہ اور علم الکلام کی نکتہ آفرینیوں سے صرفِ نظر کر کے محض وحی ربانی پر منحصر ان اساسی عوامل پر اپنی پوری توجہ مرکوز کی گئی جو انسان کی مثبت فعالیت کے اصل محرکات ہیں۔ ان ہی کو قرآن حکیم میں انسان کے فائدہ اور خسران کا اصل منبع و محور قرار دیا گیا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَالْعَصْرِ ۱ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۲ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۳﴾ (العصر)

’’قسم ہے زمانے کی۔ تمام انسان خسارے میں ہیں۔ سوائے اُن کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے اور جو ایک دوسرے کو حق کی وصیت کرتے رہے‘ اور جو ایک دوسرے کو صبر و تحمل کی تاکید کرتے رہے۔‘‘

انسان کے روحانی ارتقا کے عوامل

انسان کے اعلیٰ کردار اور روحانی ارتقا کے لیے تین عوامل ناگزیر ہیں: (i) اللہ‘ اس کے رسول اور آخرت پر کامل ایمان (ii) عملِ صالح (iii) اخلاقِ حسنہ۔ یہ سب اعلیٰ اوصاف اور فکری بلندی کے وہ مضبوط ستون ہیں جن سے انسانی وجود میں ناقابلِ تسخیر قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس مقام پر پہنچنے کے لیے اس فلسفہ و حکمت کو حرزِ جان بنانا لازمی ہے جو اللہ کے رسول ﷺ نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔

اس بلند و بالا منزل پر پہنچنے کے لیے پہلی سیڑھی ایمانِ راسخ ہے۔ ایمان کی جڑیں انسان کے باطن میں اپنی جگہ بنالیں تو اس کے ارادوں‘ ولولوں اور قربِ الٰہی کی تڑپ کو تازہ اور توانا خون مہیا ہوتا ہے اور اُس کی شخصیت کی نشوونما کو نئی زندگی ملتی ہے۔ ایمان و یقین کی قوت ہی الحاد و مادہ پرستی کی جڑوں پر تیشہ چلاتی ہے۔ حق و صداقت کی روشنی سے اس کی ذات کے اندھیرے دور ہوتے ہیں۔ زیغ و ضلال کی گمراہیاں انسانی وجود کو تارِ عنکبوت کی مانند گھیرے رہتی ہیں۔ ایسے میں اگر ایمان کی شمع روشن ہو جائے تو فسق و فجور کی تیرگی یوں معدوم ہو جاتی ہے جیسے سورج طلوع ہونے کے بعد چاند کی کرنیں بے نور لگنے لگتی ہیں۔

انسان کے ارتقا کے لیے دوسری شے اس کی عملی زندگی کی شفافیت اور صالحیت ہے۔ ایمان اور عمل ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ اگر دل کی گہرائیوں میں ایمان راسخ ہوگا

تو اس کا اظہار عمل سے ہونا لازمی ہے۔ بوتل صاف ہو تو اندر کا مادہ باہر ہی سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ اگر فکر درست ہوگی تو انسان کا عمل بھی تیر کی طرح سیدھا ہوگا اور اگر فکر میں ہی کوئی کج روی اور بگاڑ ہے تو اس کا اظہار عمل سے مترشح ہوگا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ؒ ’’حجۃ اللہ البالغۃ‘‘ میں لکھتے ہیں:

’’انسان اپنے ارادہ و اختیار سے جو عمل بھی انجام دیتا ہے وہ اس کے باطن اور نفس ناطقہ میں ایک پائیدار اثر چھوڑتا ہے جو اس عمل کا نتیجہ ہوتا ہے کہ عمل کی نوعیت کی مطابق اس کا نفس یا نورانی بنتا جاتا ہے یا اس پر ظلمت چھا جاتی ہے۔‘‘

قلبی ایمان اعمال ظاہرہ کا متقاضی اور اس میں مداومت سے مشروط ہے۔ اسی طور سے اعمالِ صالحہ پر استقامت قلبی ایمان کی حرارت کو برقرار رکھتی ہے‘ اس میں تر و تازگی اور رعنائی کے عنصر کو ختم ہونے نہیں دیتی۔ انسانیت کے اعلیٰ مرتبے پر پہنچنے کے لیے تیسری چیز اخلاقِ حسنہ ہے۔ یہ انسانی اوصاف کا وہ عطر ہے جس سے پورا معاشرہ مہکتا رہتا ہے۔ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ (وفی روایة صَالِحَ) الْاَخْلَاقِ))
(السلسلة الصحيحة:۴۵)

’’مجھے تو عمدہ اخلاق کی تکمیل کے لیے ہی بھیجا گیا ہے۔‘‘

ایک موقع پر نبی کریم ﷺ سے سوال کیا گیا کہ کون سی چیز اکثر لوگوں کو جنت میں لے جائے گی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ((تَقْوَى اللّٰهِ وَحُسْنُ الْخُلُقِ)) (صحيح ابن حبان)
’’اللہ کا تقویٰ اور خوش خلقی۔‘‘

حسنِ اخلاق انسانی معاشرے میں امن و سلامتی کا ضامن ہوتا ہے۔ اخلاقی تقاضے حیاتِ دنیوی کے ہر شعبہ میں ہونا لازم ہیں۔ کسی معاشرے کی انفرادی اور اجتماعی سطحوں پر بگاڑ پیدا ہونا دراصل اخلاقیات سے غفلت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ رسولِ کریم ﷺ سے سوال کیا گیا: نحوست کیا چیز ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ((الشُّؤْمُ: سُوءُ الْخُلُقِ)) (رواه احمد) یعنی دین میں اگر نحوست والی کوئی شے ہے تو وہ بُرا اخلاق ہے۔ بالعموم ہر معاشرے میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی بدتمیزیوں‘ اکڑفوں اور لفنگے پن سے لوگ خوف زدہ رہتے ہیں کہ نہ جانے کب یہ کسی کی بھی عزّت خاک میں ملا دیں۔ ایسا انسان جو دوسروں کے لیے خوف کی علامت ہو‘ درحقیقت شرفِ انسانیت سے محروم ہو جاتا ہے۔

رسول اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں

غور طلب امر یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ سے از روئے قرآن حکیم ہمارے تعلق اور نسبت کی نوعیت کیا ہے! اس سلسلے میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۵۷﴾﴾ (الاعراف)

پس وہ لوگ جو ایمان لائے ان (نبی ﷺ) پر اور جنہوں نے ان کی توقیر و تعظیم کی اور جنہوں نے ان کی مدد اور حمایت کی اور جنہوں نے اس نور کا اتباع کیا جو اُنؐ پر نازل کیا گیا، یہی وہ لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں۔''

آیت کے اس حصے سے رسول ﷺ سے ہمارے تعلق کی اصل بنیاد سامنے آتی ہے جس پر عمل پیرا ہو کر ہم اس آیت کا مصداق بنتے ہیں کہ ''رسول کی اطاعت ہی دراصل اللہ کی اطاعت ہے۔''

رسول اکرم ﷺ کی اطاعت کا اوّلین تقاضا تو یہ ہے کہ ان پر صمیم قلبی سے ایمان لایا جائے۔ آپ ﷺ اور اُمّتِ مُسلمہ کا مضبوط ترین تعلق ایمان بالرسالت کے حوالے سے ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ پورے عالم کے لیے ہادی و رہنما بنا کر مبعوث کیے گئے ہیں۔ اس اعتبار سے آخرت میں بھی وہی شخص مؤمن قرار پائے گا جس نے اللہ کے رسول ﷺ کی رسالت پر زبانی اقرار کے ساتھ دل سے بھی اس کی تصدیق کی ہو۔ اقرارٌ باللسان اور تصدیقٌ بالقلب لازم و ملزوم ہیں۔ ایمان کی تکمیل ان دونوں کے اشتراک و ارتباط سے ہوتی ہے۔

دوسرے درجے میں ایمان کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کی تعظیم و توقیر کی جائے۔ اس کی وضاحت سورۃ الحجرات میں ان الفاظ میں کی گئی ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴿۲﴾﴾

''اے ایمان والو! مت بلند کرو اپنی آوازوں کو نبی (ﷺ) کی آواز پر اور نہ ان سے گفتگو میں آواز کو اس طرح بلند کرو جس طرح تم ایک دوسرے سے باہم گفتگو کرتے ہو، مبادا تمہارے اعمال برباد ہو جائیں اور تمہیں اس کا شعور تک نہ ہو۔''

نبی اکرم ﷺ سے ہمارا تعلق ایمان بالرسالت کے دو اہم اجزاء کے باہمی ربط سے اپنے منطقی انجام کو پہنچتا ہے۔ ایک ہے رسول ﷺ کی بے ریا اطاعت اور دوسرے محبت رسول ﷺ۔ اللہ کے رسول ﷺ سے محبت کا دعویٰ محض جھنڈے لگا کر، سیرت کانفرنسیں کروا کر، آپ ﷺ پر درود و سلام بھیج کر اور وجد کی کیفیت میں نعتیں پڑھ کر نتیجہ خیز نہیں ہوسکتا اور نہ اس طرح حق اطاعت و اتباع ہی ادا ہوسکتا ہے۔ اس کی وضاحت رسالت مآب ﷺ نے ان الفاظ میں فرمائی ہے:

((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰی یَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ))(شرح السنة)

''تم میں سے کوئی مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی خواہشِ نفس اس (ہدایت) کے تابع نہ ہو جائے جو مَیں لے کر آیا ہوں۔''

گویا ایمان کے دعویدار جب تک ان تمام احکامِ شریعت، حدود و قیود اور اوامر و نواہی کو دل کی پوری آمادگی کے ساتھ تسلیم نہ کر لیں جو رسولِ برحق ﷺ نے قرآن و سنّت کے حوالے سے تعلیم فرمائے ہیں تب تک ایمان کا تقاضا پورا نہیں ہوسکتا۔ اس روئے ارض پر اللہ نے کوئی رسول ایسا نہیں بھیجا جس کی قلبی اور شعوری اطاعت لازمی قرار نہ دی ہو۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ﴾ (النساء:۶۴)

''اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اسی لیے کہ اللہ کے حکم سے اُس کی اطاعت کی جائے۔''

اسی سورۂ مبارکہ میں فرمایا:

﴿مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ﴾ (آیت ۸۰)

''جس شخص نے رسول کی اطاعت کی تو اس نے اللہ کی اطاعت کی۔''

اللہ کے احکام و فرامین بندوں تک پہنچانے کا ذریعہ رسولوں ہی کو بنایا جاتا ہے، اس لیے رسول ﷺ کی اطاعت گویا اللہ ہی کی اطاعت ہے۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ رسول صرف تبلیغِ وحی کے لیے نہیں آتے بلکہ عملی طور پر کتاب اللہ کا نمونہ بھی ہوتے ہیں، اس لیے ہر عمل میں ان کی اطاعت لازمی ہے۔ اسی بات کو خود رسول کریم ﷺ نے ان الفاظ میں ارشاد فرمایا:

((مَنْ اَطَاعَنِیْ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ عَصَی اللّٰهَ))(متفق علیه)

''جس نے میری اطاعت کی تو اس نے اللہ کی اطاعت کی، اور جس نے میری نافرمانی کی تو اُس نے اللہ کی نافرمانی کی۔''

ایمان بالرسالت کا دوسرا اہم پہلو آپ ﷺ سے سچی اور والہانہ محبت ہے جس میں کسی قسم کی مجبوری اور ریاکاری نہ پائی جاتی ہو۔ یہ دل کی پوری آمادگی اور پورے شرح صدر کے ساتھ کی جائے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ)) (متفق علیه)

’’تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ مَیں اُس کے لیے اُس کے باپ‘ اُس کی اولاد اور تمام انسانوں سے محبوب تر نہ ہوجاؤں۔‘‘

رسول اللہ ﷺ کے ہر حکم اور ہر فرمان کی محض اطاعت ہی مطلوب نہیں بلکہ آپؐ کی ہر ہر ادا کی پیروی بھی باعث سعادت ہے۔ جن کاموں کے کرنے کی ترغیب و تشویق دلائی گئی ہے وہ طوعاً و کرہاً واجب الادا ہیں‘ لیکن جن کا حکم دربارِ رسالت سے جاری نہیں ہوا‘ ان معمولاتِ زندگی کو اپنے لیے از خود لازم کرلینا حُبِ رسول ﷺ کا ثبوت ہے۔ اسی کا نام اتباع رسول ﷺ ہے۔ گویا بقول مرزا غالب ؎

جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

رسول کریم ﷺ کی محبت تکمیل ایمان کی نشانی ہے۔ اگر اس میں کوئی فکری اور عملی سقم موجود ہوگا تو ایمان نامکمل ہوگا۔ رسول کریم ﷺ کے لیے صداقت سے لبریز اور دل کی گہرائیوں میں جاگزیں محبت اور جذبہ اطاعت ایک مؤمن کا بیش بہا سرمایہ ہے اور کسی مؤمن کا دل اس نعمت عظمیٰ سے خالی نہیں ہوسکتا۔ یہی اپنے محبوبِ حقیقی کے قرب اور اس کی ذات و صفات کے صحیح تصور کا واحد وسیلہ ہے۔ اگر دل میں محبت ہوگی تو اتباع و اطاعت کا جذبہ بھی لازماً پروان چڑھے گا‘ کیونکہ یہ محبت کا منطقی تقاضا ہے۔

بحیثیت اُمتی ہمارے فرائض

ان سب داعیات سے جو فکری اور عملی روح بیدار ہوگی وہ ایک مسلمان کے قلب و ذہن میں یہ حقیقت واضح کردے گی کہ بحیثیت اُمتی اس کا کیا فرض بنتا ہے۔ اب جبکہ نبوت و رسالت کی تکمیل محمد عربی ﷺ پر ہوچکی ہے‘ اس کارِ رسالت کو کون آگے بڑھائے گا‘ اس لیے کہ ؎

وقتِ فرصت ہے کہاں‘ کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے!

یہ ختمِ نبوت و رسالت کا لازمی تقاضا ہے کہ اب وہ سارے کام جو اللہ کے رسول ﷺ کیا کرتے تھے‘ اس اُمّت کے ذمّے ہیں۔ دعوت و تبلیغ‘ انذار و تبشیر‘ تعلیم و تربیت‘ اصلاح و تزکیہ‘ شہادتِ حق‘ اعلاءِ کلمۃ اللہ‘ اقامتِ دین اور اظہارِ دینِ حق‘ یہ سب فرائض اب ان لوگوں پر عائد ہوتے ہیں جو حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے نام لیوا ہیں‘ اور جو آپ ﷺ کے امتی ہونے کو باعثِ سعادت سمجھتے ہیں۔ درحقیقت انسان کی کردار سازی اور اس کی مؤمنانہ تعمیر شخصیت کے لیے اللہ کے رسول ﷺ کی ذات میں بہترین اُسوہ (نمونہ) ہے۔ صرف اسی کو اختیار کر کے انسان اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا قرب حاصل کرسکتا ہے اور شافعِ محشر ﷺ کی شفاعت سے بھی اپنے دامنِ عصیاں کو بھر سکتا ہے ؎

کی محمد (ﷺ) سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا‘ لوح و قلم تیرے ہیں!

☆......☆......☆

امت مسلمہ سے خطاب کے ضمن میں قرآن کی جامع ترین سورت
سُورةُ الحدید
(اُمُّ المُسَبِّحات) کی مختصر تشریح
ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ
اشاعت خاص 500 روپے، اشاعت عام 225 روپے
مکتبہ خدام القرآن لاہور
قرآن اکیڈمی، 36۔کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: (042)35869501-03
فیکس: (042)35834000 ای میل: maktaba@tanzeem.org
ویب سائٹ: www.tanzeem.org

اَعمال میں اِخلاص

احمد علی محمودی

اخلاص کی تعریف

''خَلَصَ يَخْلُصُ خُلُوصًا و خَلَاصًا'' کے معنی صاف ہونے اور آمیزش کے زائل ہوجانے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے: ''خَلَصَ مِن وَرَطَتِه'' یعنی وہ اپنے بھنور سے محفوظ رہا اور نجات پا گیا۔ اسی طرح: ''خَلَّصَه تخليصًا'' یعنی اس نے اسے چھٹکارا اور نجات دلوائی۔ اطاعت میں اخلاص کے معنی ریاکاری ترک کردینے کے ہیں۔ (اَخْلَصَ الطَّاعَةَ وَفِي الطَّاعَةِ)

اخلاص کسی عمل کو اللہ تعالیٰ کی طرف پھیرنے اور اس سے قربت حاصل کرنے کا نام ہے' جس میں کوئی ریا و نمود اور بناوٹ نہ ہو۔ بندہ صرف اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید کرے' اس کے عذاب سے ڈرے اور اس کی رضامندی کا حریص ہو۔

اخلاص کی اہمیت اور قرآنی آیات

(۱) اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق یعنی جن و انس کو محض اپنی عبادت کے لیے پیدا فرمایا ہے' جس کا کوئی شریک نہیں اور تمام مکلفین (جن پر شریعت کے احکام لاگو ہوتے ہیں) کو اخلاص کا حکم دیا ہے۔ فرمایا:

﴿وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ﴾ (البینة:۵)

''اور انہیں صرف یہی حکم دیا گیا تھا کہ اللہ کی عبادت کریں ایک رخ ہو کر خالص اسی کی اطاعت کی نیت سے۔''

(۲) اخلاص تمام عبادات اور نیک اعمال کی روح ہے۔ قرآن مجید میں اللہ ربّ العزت نے ارشاد فرمایا:

﴿فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝۲ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ۭ﴾ (الزمر)

''پس تم خالص اللہ ہی کی فرماں برداری مدِّنظر رکھ کر اسی کی عبادت کرو۔ خبردار! خالص فرماں برداری اللہ ہی کے لیے ہے۔''

اس آیت کریمہ میں انسان کو عبادت کا حکم دیا جا رہا ہے' جو ظاہر ہے اللہ ہی کے لیے ہوتی ہے۔ لیکن یہاں جو بات اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کی عبادت کس حال میں کی جائے۔ دو بار اخلاص یعنی مخلص اور خالص کے ذکر سے معلوم ہوا کہ بندگی میں مخلص ہونا اور اللہ کے لیے اطاعت گزاری کو خالص کر لینا ہی اس کی عبادت میں اخلاص ہے۔ اور عبادت اگر اخلاص سے خالی ہوگی تو اللہ تعالیٰ کے ہاں قبولیت کا درجہ نہیں پا سکے گی۔

(۳) ﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۶۲ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ۝۱۶۳﴾ (الانعام)

''فرما دیجیے! بالیقین میری نماز اور میری ساری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا یہ سب خالص اللہ ہی کا ہے جو سارے جہانوں کا مالک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں' اور مجھ کو اسی کا حکم ہوا ہے' اور میں سب ماننے والوں میں سے پہلا ہوں۔''

(۴) ﴿الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۭ﴾ (الملک:۲)

''جس نے موت اور حیات کو اس لیے پیدا کیا کہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے اچھے کام کون کرتا ہے۔''

حضرت فضیل بن عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اچھا عمل یعنی سب سے خالص اور درست ترین عمل''۔ لوگوں نے عرض کیا: اے ابوعلی! سب سے خالص اور درست عمل کیا ہے؟ فرمایا: ''عمل جب خالص اللہ کے لیے ہو لیکن درست نہ ہو تو قبول نہیں ہوتا' اور اگر درست ہو مگر خالص نہ ہو تو بھی قبول نہیں ہوتا' یہاں تک کہ (بیک وقت) خالص اور درست ہو۔ خالص کا مطلب یہ ہے کہ وہ عمل اللہ کی رضا کے لیے کیا گیا ہو اور درست کا مطلب یہ ہے کہ سُنّتِ نبوی ﷺ کے مطابق ہو۔'' پھر انہوں نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَاۗءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ۝۱۱۰﴾ (الکہف)

''فرما دیجیے! میں تو تم جیسا ہی ایک انسان ہوں' (ہاں) میری جانب وحی کی جاتی ہے کہ تم سب کا معبود صرف ایک ہی معبود ہے۔ تو جسے بھی اپنے پروردگار سے ملنے کی آرزو ہو' اسے چاہیے کہ نیک اعمال کرے اور اپنے پروردگار کی عبادت میں کسی کو بھی شریک نہ کرے۔''

(۵) ﴿فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿١٤﴾﴾ (غافر)
''پس تم اللہ کی عبادت اسی کے لیے طاعت و بندگی کو خالص رکھتے ہوئے کیا کرو' اگرچہ کافروں کو یہ ناگوار ہی ہو''۔

اخلاص کی اہمیت اور احادیث مبارکہ

(۱) حضرت عمر بن الخطاب ؓ سے مروی ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:
((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّةِ، وَاِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوٰى، فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ فَهِجْرَتُهُ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ، وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ لِدُنْيَا يُصِيْبُهَا، اَوِ امْرَاَةٍ يَتَزَوَّجُهَا، فَهِجْرَتُهُ اِلٰى مَا هَاجَرَ اِلَيْهِ)) (رواه البخاري:١/٣٠'٥٤)
''بے شک اعمال کا دارومدار نیت پر ہے' اور بے شک ہر شخص کے لیے وہی ہے جس کی اُس نے نیت کی۔ پس جس نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف ہجرت کی اُسی کی ہجرت اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے لیے ہی شمار ہوگی' اور جس کی ہجرت دنیا حاصل کرنے یا کسی عورت سے شادی کرنے کے لیے ہوئی تو اس کی ہجرت اسی کے لیے ہے جس کی طرف اس نے ہجرت کی۔''

(۲) حضرت سہل بن حنیف ؓ سے مروی ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:
((مَنْ سَاَلَ اللّٰهَ الشَّهَادَةَ بِصِدْقٍ، بَلَّغَهُ اللّٰهُ مَنَازِلَ الشُّهَدَاءِ، وَاِنْ مَاتَ عَلٰى فِرَاشِهِ)) (رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَالنَّسَائِيُّ وَأَبُو دَاوُد وَابْنُ مَاجَه)
''جس نے اللہ تعالیٰ سے صدقِ دل کے ساتھ شہادت (کی موت) طلب کی تو اللہ تعالیٰ اسے شہداء کا مقام عطا فرمائے گا' خواہ اسے بستر پر ہی موت (کیوں نہ) آئی ہو۔''

(۳) حضرت ابو محمد حسن بن علی ؓ بیان کرتے ہیں کہ مجھے حضور نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد (آج بھی) یاد ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:
((دَعْ مَا يَرِيْبُكَ اِلٰى مَا لَا يَرِيْبُكَ، فَاِنَّ الصِّدْقَ طُمَأْنِيْنَةٌ، وَاِنَّ

الْكَذِبَ رِيْبَةٌ)) (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ)
''شک وشبہ والی چیز چھوڑ کر شک سے پاک چیز کو اختیار کرو۔ بے شک سچ سکون و اطمینان ہے اور جھوٹ شک وشبہ ہے۔''

(۴) حضرت انس بن مالک ؓ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:
((مَنْ فَارَقَ الدُّنْيَا عَلَى الْاِخْلَاصِ لِلّٰهِ وَحْدَهُ، وَعِبَادَتِهِ لَا شَرِيْكَ لَهُ، وَاِقَامِ الصَّلَاةِ، وَاِيْتَاءِ الزَّكَاةِ، مَاتَ وَاللّٰهُ عَنْهُ رَاضٍ)) (رَوَاهُ ابْنُ مَاجَه وَالْحَاكِمُ)
''جو شخص اللہ وحدہ لاشریک کے لیے کامل اخلاص پر اور بلا شرک اس کی عبادت پر' نماز قائم کرنے پر اور زکوٰۃ دینے پر ہمیشہ عمل پیرا رہتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوگا' اس کی موت اس حال میں ہوگی کہ اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہوگا۔''

(۵) حضرت ابو امامہ ؓ سے مروی ہے:
جَآءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: اَرَاَيْتَ رَجُلًا غَزَا يَلْتَمِسُ الْاَجْرَ وَالذِّكْرَ مَالَهُ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَا شَيْئَ لَهُ)) فَاَعَادَهَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، يَقُوْلُ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَا شَيْئَ لَهُ)) ثُمَّ قَالَ: ((اِنَّ اللّٰهَ لَا يَقْبَلُ مِنَ الْعَمَلِ اِلَّا مَا كَانَ لَهُ خَالِصًا وَابْتُغِيَ بِهِ وَجْهُهُ)) (رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَالطَّبَرَانِيُّ)
''ایک شخص حضور نبی اکرم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر عرض گزار ہوا: دیکھیے! اگر کوئی شخص لالچ اور طمع کی خاطر یا ناموری کے لیے جہاد کرے تو اسے کیا ملے گا؟ حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اسے کوئی ثواب نہیں ملے گا''۔ اُس شخص نے یہی سوال تین دفعہ کیا اور حضور نبی اکرم ﷺ نے ہر بار یہی جواب عنایت فرمایا کہ اسے کچھ ثواب نہیں ملے گا۔ بعد ازاں حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ صرف وہی عمل قبول فرماتا ہے جو خالص اس کے لیے ہو اور اسے کرنے سے محض اللہ تعالیٰ کی رضامندی مقصود ہو۔''

(۶) حضرت معاذ بن جبل ؓ کو جب یمن کی طرف (گورنر بنا کر) بھیجا گیا تو انہوں نے بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! مجھے نصیحت فرمائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((اَخْلِصْ دِیْنَکَ یَکْفِکَ الْعَمَلُ الْقَلِیْلُ)) (رَوَاہُ الحَاکِمُ وَالْبَیْہَقِیُّ)

’’دین میں اخلاص پیدا کر‘ تجھے تھوڑا عمل بھی کافی ہوگا۔‘‘

(۷) حضرت ثوبان ؓ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

((طُوْبٰی لِلْمُخْلِصِیْنَ اُولٰئِکَ مَصَابِیْحُ الْھُدٰی تَتَجَلّٰی عَنْھُمْ کُلُّ فِتْنَۃٍ ظَلْمَاءَ)) (رَوَاہُ ابْنُ أَبِي شَيْبَةَ وَالْبَيْهَقِيُّ)

’’اخلاص سے کام کرنے والوں کے لیے خوش خبری ہے۔ یہ لوگ ہدایت کے چراغ ہیں‘ ان کے ذریعے ہر سیاہ فتنہ چھٹ جاتا ہے۔‘‘

(۸) حضرت منصور بن معتمر ؓ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((تَحَرَّوُا الصِّدْقَ وَاِنْ رَاَیْتُمْ فِیْہِ الْھَلَکَۃَ فَاِنَّ فِیْہِ النَّجَاۃَ)) (رَوَاہُ ابْنُ أَبِي الدُّنْيَا)

’’سچ بولو اگرچہ اس میں تمہیں ہلاکت نظر آئے (کیونکہ) نجات اسی میں ہے۔‘‘

ایک عجیب واقعہ

امام محمد غزالیؒ نے ’’احیاء العلوم‘‘ میں لکھا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص ہر وقت عبادت میں مشغول رہتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک جماعت اس کے پاس آئی اور کہا کہ یہاں ایک قوم ہے‘ جو ایک درخت کو پوجتی ہے۔ یہ سن کر اس کو غصہ آیا اور کلہاڑا کندھے پر رکھ کر اس کو کاٹنے کے لیے چل دیا۔ راستے میں اسے شیطان ایک پیر مرد کی صورت میں ملا۔ عابد سے پوچھا: کہاں جا رہے ہو؟ اس نے کہا: فلاں درخت کو کاٹنے جا رہا ہوں۔ شیطان نے کہا: تمہیں اس درخت سے کیا غرض‘ تم اپنی عبادت میں مشغول رہو۔ تم نے اپنی عبادت کو ایک مہمل اور بے کار کام کے لیے چھوڑ دیا۔ عابد نے کہا: لوگوں کو شرک سے بچانا بڑی عبادت ہے۔ شیطان نے کہا: میں تمہیں نہیں کاٹنے دوں گا۔ اس پر دونوں کا مقابلہ ہوا۔ وہ عابد اس کے سینے پر چڑھ گیا۔ شیطان نے اپنے کو عاجز دیکھ کر خوشامد کی اور کہا کہ اچھا ایک بات سن لے۔ عابد نے اس کو چھوڑ دیا۔ شیطان نے کہا: خدا نے تجھ پر اس درخت کو کاٹنا فرض تو کیا نہیں۔ تیرا اس سے کوئی نقصان نہیں۔ تو اس کی پرستش و پوجا نہیں کرتا۔ خدا کے بہت سے نبی ہیں‘ اگر وہ چاہتا تو کسی نبی کے ذریعے اس کو کٹوا دیتا۔ عابد نے کہا کہ میں ضرور کاٹوں گا۔ دونوں میں پھر مقابلہ ہوا۔ وہ عابد پھر اس کے سینے پر

چڑھ گیا۔ شیطان نے کہا: اچھا سن‘ ایک فیصلہ کن بات جو میں تیرے نفع کی کہوں گا۔ عابد نے کہا: کہہ۔ شیطان نے کہا کہ تو غریب آدمی ہے۔ دنیا پر بوجھ بنا ہوا ہے۔ تو اس کام سے باز آ۔ میں تجھے روزانہ تین دینار دیا کروں گا‘ جو روزانہ تیرے سرہانے کے نیچے رکھے ہوئے ملا کریں گے۔ تیری بھی ضرورتیں پوری ہو جایا کریں گی‘ اپنے اعزہ و اقارب پر بھی احسان کر سکے گا۔ فقیروں کی بھی مدد کر سکے گا اور بہت سے ثواب کے کام حاصل کرے گا۔ درخت کاٹنے میں تو فقط ایک ہی ثواب ہوگا اور وہ بھی رائیگاں جائے گا‘ وہ لوگ پھر دوسرا درخت لگا لیں گے۔ عابد کو سمجھ میں آ گیا (کسی نے پنجابی میں کیا خوب کہا ہے: ’’جدوں رب رُسّے تے مت کھسّے‘‘ یعنی جب رب ناراض ہو تو عقل ختم ہو جاتی ہے)۔ عابد نے اس پیشکش کو قبول کر لیا اور گھر آ گیا۔ دو دن تک دینار تکیے کے نیچے سے ملے‘ تیسرے دن کچھ بھی نہ ملا۔ عابد کو پھر غصہ آیا اور اسی طرح کلہاڑا لے کر چلا۔ راستہ میں وہ بوڑھا اسے پھر ملا‘ تو پوچھا: جناب کہاں جا رہے ہو؟ عابد نے کہا کہ اسی درخت کو کاٹنے جا رہا ہوں۔ بوڑھے نے کہا: تو اس کو نہیں کاٹ سکتا۔ دونوں میں لڑائی ہوئی اور وہ بوڑھا (یعنی شیطان) غالب آ گیا اور عابد کے سینے پر چڑھ گیا۔ عابد کو بڑا ہی تعجب ہوا۔ اس سے پوچھا: یہ کیا بات ہے کہ تو اس مرتبہ غالب آ گیا؟ شیطان نے کہا کہ پہلی مرتبہ تیرا غصہ خالص خدا کے لیے تھا‘ اس لیے خدا نے مجھے مغلوب کر دیا اور تجھے غالب۔ اس مرتبہ تیرے دل میں دیناروں کی طلب تھی‘ خدا کی رضا اور اخلاص نہ تھا۔ اس لیے تو مغلوب ہوا اور میں غالب۔

حق یہ ہے کہ جو بھی کام اخلاص اور رب تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے کیا جائے تو اس میں بڑی قوت و برکت ہوتی ہے اور جس کام میں حرص و لالچ کا دخل ہو‘ اس عمل میں کوئی طاقت اور برکت نہیں ہوتی۔

نیت: عمل کی محرک

اخلاص نیت کے حوالہ سے حجۃ الاسلام امام محمد غزالی ؒ ’’کیمیائے سعادت‘‘ میں فرماتے ہیں: ’’نیت کسی عمل کے محرک و متقاضی کو کہتے ہیں۔ یہ باعث و محرک اگر ایک ہے تو اس نیت کو خالص کہتے ہیں اور جب دو یا دو سے زیادہ چیزیں اس عمل کی محرک ہوں تو چونکہ اس میں شرکت ہوگئی اس لیے وہ خالص نہ رہی۔ اس شرکت کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص نے خدا کے واسطے روزہ رکھا‘ ساتھ ہی اس کا مقصد یہ بھی تھا کہ کھانا ترک کرنے سے تندرستی حاصل کرے‘

ساتھ ہی خرچ کچھ کم ہو جائے گا' یا کھانا پکانے کی مشقت سے نجات حاصل ہو' یا اطمینان کے ساتھ ایک کام کو انجام دے سکے' یا صوم کے سبب سے بیدار رہے اور بیدار رہ کر کچھ کام کر سکے۔

اخلاص کیا ہے؟

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت حذیفہ ؓ سے دریافت کیا کہ اخلاص کیا چیز ہے؟ انہوں نے جواب دیا: میں نے حضور نبی اکرم ﷺ سے دریافت کیا تھا کہ اخلاص کی حقیقت کیا ہے؟ تو حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: مَیں نے جبریل علیہ السلام سے سوال کیا تھا کہ اخلاص کیا ہے؟ جبریل علیہ السلام نے کہا: مَیں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ اخلاص کیا ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وہ میرے رازوں میں سے ایک راز ہے' میں اپنے بندوں سے جس کے دل میں چاہتا ہوں اس کو امانت کے بطور رکھ دیتا ہوں۔''

کسی دانا سے مخلص کی پہچان ونشانی دریافت کی گئی۔ فرمایا: مخلص وہ ہوتا ہے جو اپنی بھلائیوں کو اس طرح چھپاتا ہے جیسے اپنی برائیوں کو۔ پھر عرض کیا گیا: اخلاص کی آخری حد کیا ہے؟ فرمایا: اخلاص کی انتہا یہ ہے کہ مجھے لوگوں سے اپنی تعریف سننا پسند نہ آئے۔

اخلاص کی مثالیں

سیر وتواریخ کے مطالعہ کے دوران جب ہماری نگاہوں سے سلف صالحین کے اخلاص وللّٰہیت سے متعلق واقعات گزرتے ہیں تو ہمارے دل ودماغ روشن ہو جاتے ہیں' نیز ایمانی روح عش عش کر اٹھتی ہے۔ اس سلسلے میں بے شمار مثالیں موجود ہیں' جن میں سے چند ایک پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

حضرت علی مرتضیٰ ؓ ایک بار بڑی کشاکش کے بعد کسی دشمن کافر پر غالب آئے اور اُس کے سینے پر اس نیت سے بیٹھ گئے کہ تلوار کے ایک ہی وار سے اس کا کام تمام کر دیں' لیکن اسی دوران اس کافر نے آپ کے چہرۂ مبارک پر تھوک دیا۔ اس کے تھوکتے ہی آپ نے اسے چھوڑ دیا۔ اس پر اس کو بڑا تعجب ہوا۔ پوچھا: اے علی! بڑی مشکل سے تم مجھ پر غالب آئے تھے' پھر تم نے مجھے چھوڑ کیوں دیا؟ فرمایا کہ پہلے خالص لوجہ اللہ تجھے واصل جہنم کرنے کا ارادہ تھا۔ جب تم نے میرے چہرے پر تھوک دیا تو اس سبب سے نفس کا معاملہ آڑے آ گیا اور اخلاص نہ رہا۔ اسی

وجہ سے میں نے تیرے قتل سے ہاتھ روک لیا۔ یہ سن کر وہ مسلمان ہو گیا۔

حضرت سفیان ثوری ؒ اخلاص کے معاملہ میں اس قدر احتیاط سے کام لیتے تھے کہ وہ کسی سے ہدیہ تک بھی قبول نہیں فرمایا کرتے تھے۔ ایک بار ایک شخص ہدیہ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسے قبول کرنے کی درخواست کی۔ آپ نے انکار کرتے ہوئے فرمایا: ممکن ہے کہ تم نے کبھی مجھ سے درسِ حدیث لیا ہو۔ اس شخص نے کہا: مَیں سچ کہتا ہوں کہ مَیں نے کبھی آپ سے درسِ حدیث نہیں لیا ہے۔ آپ نے فرمایا: تم سچ کہتے ہو' لیکن تمہارا بھائی مجھ سے پڑھتا ہے' تو مجھے اس بات کا ڈر ہے کہ کہیں اس ہدیہ کی وجہ سے مَیں تمہارے بھائی پر زیادہ شفقت نہ کرنے لگ جاؤں۔

اخلاص کی برکت

اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ اخلاص کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچنے والے اعمالِ صالحہ کا اجر وثواب اللہ تعالیٰ کے نزدیک بے حساب ہے۔ بندہ مخلص اسے بروزِ قیامت اپنی آنکھوں سے دیکھے گا اور انعامات سے مستفیض ہوگا' لیکن دنیا میں بھی مخلص بندے کو متعدد برکات وحسنات سے نوازا جاتا ہے۔

حضرت مالک بن دینارؒ ریاضت کے ابتدائی ایام میں شام کے مشہور شہر دمشق کی ایک مسجد میں اعتکاف کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ یہ خیال آیا کہ کوئی صورت ایسی ہو جائے کہ مجھے اس مسجد کا متولی بنا دیا جائے۔ چنانچہ آپ نے اعتکاف پر اعتکاف کیے اور اتنی کثرت سے نمازیں پڑھیں کہ ہر شخص آپ کو ہمہ وقت نماز میں مشغول دیکھتا لیکن آپ کی جانب توجہ نہ دیتا۔ ایک سال بعد جب آپ مسجد سے باہر آ رہے تھے تو ندائے غیبی آئی: ''اے مالک بن دینار! تجھے اب تائب ہو جانا چاہیے''۔ چنانچہ اب آپ کو اپنی ایک سال کی خود غرضانہ عبادت پر شدید رنج وشرمندگی ہوئی اور آپ نے اپنے قلب کو ریا سے مبرا کر کے ایک شب خلوص نیت کے ساتھ عبادت کی توصبح کے وقت دیکھا کہ مسجد کے دروازے پر ایک مجمع ہے جو آپس میں کہہ رہا ہے کہ مسجد کا انتظام ٹھیک نہیں ہے' لہٰذا اس شخص کو متولی بنا دیا جائے اور تمام انتظامی امور اس کے سپرد کر دیے جائیں۔

اس کے بعد متفق ہو کر پورا مجمع آپ کے پاس پہنچا اور عرض کیا کہ ہم باہمی متفقہ فیصلے سے

آپ کو مسجد کا متولی بنانا چاہتے ہیں۔ یہ سن کر آپ حیران رہ گئے اور بارگاہِ خداوندی میں عرض پرداز ہوئے: ''اے اللہ! میں ایک سال ریاکارانہ عبادت میں اس لیے مشغول رہا کہ مجھے مسجد کی تولیت مل جائے مگر ایسا نہ ہوا اور اب جب مَیں صدقِ دل کے ساتھ ایک رات تیری عبادت میں مشغول ہوا تو تمام لوگ تیرے حکم سے مجھے متولی بنانے آ پہنچے اور میرے اوپر یہ بار ڈالنا چاہتے ہیں‘ لیکن میں تیری عظمت کی قسم کھاتا ہوں کہ میں نہ تو اب تولیت قبول کروں گا اور نہ مسجد سے باہر نکلوں گا۔'' یہ کہہ کر پھر عبادت میں مشغول ہو گئے۔

اللہ کے پسندیدہ بندے

حضرت سعد بن ابی وقاص ؓ سے روایت ہے کہ حضور خاتم النّبیین و رحمۃ للعالمین ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْعَبْدَ التَّقِيَّ الْغَنِيَّ الْخَفِيَّ)) (مسلم)

''اللہ تعالیٰ متقی‘ مخلوق سے مستغنی اور اخفا پسند بندے کو پسند فرماتے ہیں۔''

اس حدیث مبارکہ میں تین صفات کے حامل بندے کو اللہ کے پیارے نبی ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا محبوب قرار دیا ہے:

(۱) تقی: وہ بندہ جو ظاہر و باطن میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور اس کے عذاب سے ڈرتا ہو اور اس کی معصیت سے بچتا ہو۔

(۲) غنی: وہ بندہ جو لوگوں کے مال وجاہ سے کوئی غرض اور کوئی حرص ومفاد وابستہ نہ رکھتا ہو بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے فقر و حاجت کا اظہار کرتا ہو۔ وہ مخلوق سے استغنا برتتا ہو اور اللہ کے سامنے خود کو محتاج بنا کر رکھتا ہو۔

(۳) خفی: وہ بندہ جو اپنے نیک اعمال بھی مخلوق کے دکھاوے سے بچنے کے لیے چھپ کر کرتا ہو اور اگر کوئی گناہ صادر ہو جاتا ہو تو اس کو بھی چھپاتا ہو اور اس پر خوب توبہ و استغفار کرتا ہو‘ کیونکہ بندوں کے سامنے اپنے گناہوں کا اظہار بھی شریعت میں پسندیدہ نہیں ہے۔

ہدایت کے چراغ

اخلاص اور نیک نیت سے انسان کو رفعت و بلندی عطا ہوتی ہے اور یہ اس کو ابرار کی منازل پر لے جاتی ہے۔ حضرت ثوبان ؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((طوبٰی لِلْمُخْلِصِيْنَ: اَلَّذِيْنَ اِذَا حَضَرُوا لَمْ يُعْرَفُوْا، اِذَا غَابُوْا لَمْ يفتقدوا۔ اُولٰئِکَ مَصَابِيْحُ الْهُدٰى تَنْجَلِي عنهم کُلُّ فِتْنَةٍ ظُلْمَاء))

(رواه البيهقي)

''مخلصین کے لیے بشارت ہو‘ وہ لوگ کہ جب کسی جگہ موجود ہوں تو کوئی انہیں جانتا نہ ہو‘ اور جب وہ کسی جگہ موجود نہ ہوں تو ان کی کمی محسوس نہ ہو۔ یہی لوگ ہدایت کے چراغ ہیں‘ انہی کی برکت سے انسان پر آئی ہوئی مصیبت ٹلتی ہے۔''

جو شخص صفت اخلاص سے متصف ہو گا اسے کامیابی حاصل ہو گی۔ جس جماعت میں ایسے افراد ہوں گے اس میں خیر و برکات کا دور دورہ ہو گا‘ گھٹیا صفات اس میں معدوم ہوں گی۔ دنیاوی شہوات ان سے مرتفع ہوں گی۔ ملت میں اعلیٰ مقاصد کا حصول ان کا مطمحِ نظر ہو گا اور معاشرے میں امن و سلامتی عام ہو گی۔

یہ اخلاص ہی کی برکت تھی کہ صحابہ کرام ؓ میں ریا‘ نفاق اور جھوٹ بالکل معدوم تھا۔ زندگی کے اعلیٰ مقاصد کا حصول ہی ان کا مقصدِ حیات تھا۔ تمام صحابہؓ اقامتِ دین‘ اعلاءِ کلمۃ اللہ‘ عدل و انصاف کو عام کرنے اور رضائے خداوندی کو اصل مقصود سمجھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں حکومت و شوکت عطا فرمائی‘ دنیا کا مقتدا بنایا اور وہ تمام عالم کے سردار بن گئے۔

عمل میں اگر بشری کمزوری کی وجہ سے کچھ کمی رہ جائے تو اللہ تعالیٰ اخلاص کی برکت سے اس عمل کا پورا پورا اجر فرما دیتے ہیں۔ حضرت جابر بن عبداللہ ؓ سے روایت ہے غزوۂ تبوک میں ہم نبی اکرم ﷺ کے ہمراہ تھے۔ آپؐ نے فرمایا: (ہم تو یہاں جہاد کر رہے ہیں لیکن) مدینہ میں کچھ ایسے بھی ہیں جنہوں نے کوئی سفر نہیں کیا‘ کوئی وادی طے نہیں کی مگر (ثواب میں) وہ تمہارے ساتھ ہیں۔ انہیں مرض نے گھیر لیا (ورنہ نیت ان کی بھی جہاد کی تھی)۔ اور ایک روایت میں ہے ''مگر ثواب میں وہ تمہارے ساتھ شریک ہیں''۔ (ابوداؤد اور ترمذی)

اچھی نیت: عملِ خیر سے بہتر

ایک حدیث مبارکہ میں آتا ہے: ((نِيَّةُ الْمُؤْمِنِ خَيْرٌ مِنْ عَمَلِهٖ)) (المعجم الکبیر: ۵۹۴۲) ''مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے۔'' اس حدیث کی مختلف تفسیریں اور تعبیریں ہیں۔ بظاہر اس حدیث میں یہ اشکال واقع ہوتا ہے کہ عمل کرنے سے نیت کا درجہ کیسے

بڑھ سکتا ہے‘ کیوں کہ نیت توعمل سے پہلے ہوتی ہے؟ پھراس میں مشقت بھی کچھ نہیں جبکہ عمل میں مشقت ہے؟ بعض علماء نے اس کا مطلب یہ بیان فرمایا کہ انسان کئی قسم کے ہیں۔ایک وہ کہ جو نیک نیتی کرے اور عمل نہ کرے اور دوسرا وہ جو عمل تو کرتا ہے مگر نیت ٹھیک نہیں ہے۔ مثلاً عمل میں ریا کا شائبہ ہے یا کسی دنیوی غرض کو حاصل کرنے کے لیے نیک کام کر رہا ہے۔ چونکہ دوسرے شخص کی نیت ٹھیک نہیں‘ اس لیے اس کے عمل کا بھی کوئی ثواب نہیں بلکہ ریا وغیرہ کا گناہ ہوگا بخلاف اس شخص کے کہ جس نے صرف نیت کی تھی۔اس کو نیت کا ثواب تو مل گیا‘ گو وہ عمل نہ کرسکا جبکہ پہلے شخص کو نہ نیت کا ثواب ملا اور نہ عمل کا۔اس صورت میں نیت عمل سے بڑھ گئی۔

بعض علماء نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ چوں کہ عمل تو محدود ہوتا ہے جبکہ نیت انسان غیر محدود کی بھی کرسکتا ہے تو اس صورت میں نیت عمل سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔مثلاً حدیث میں ہے کہ ایک تو ایسا شخص ہے کہ جس کو خدا تعالیٰ نے مال بھی عطا فرمایا ہے اور علم بھی اور وہ اس مال کو اپنے علم کے مطابق صحیح جگہوں میں خرچ کرتا ہے‘ ظاہر ہے کہ یہ شخص ایسا ہے کہ اس کو اجر اور ثواب بہت ملے گا۔ایک دوسرا شخص ہے کہ اس کے پاس نہ مال ہے اور نہ علم ہے‘ وہ اس کو دیکھ دیکھ کر حسرت کرتا ہے کہ کاش اللہ تعالیٰ مجھے بھی اس طرح مال دیتا اور میں اس کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں اس شخص کی طرح خرچ کرتا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ((هما في الأجر سواء)) یعنی یہ دونوں اجر اور ثواب میں برابر ہیں۔وجہ یہ ہے کہ دوسرے کے پاس اگرچہ مال و دولت نہیں ہے‘ مگر اس کی نیت تو ہے کہ اگر ہوتا تو میں خرچ کرتا۔تو چوں کہ یہاں اس کی نیت شامل ہوگئی‘ اس لیے اس کو اجر وثواب میں پہلے کے برابر کر دیا گیا۔

تیسرا وہ شخص کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو مال دیا‘ مگر اس نے علم حاصل نہیں کیا‘ اس لیے اپنے مال کو عیش پرستیوں اور فضول خرچیوں میں خرچ کر رہا ہے۔کسی مفلس آدمی نے اس کو دیکھ کر کہ یہ شخص تو خوب مزے اڑا رہا ہے اور عیش کر رہا ہے‘ یہ حسرت کی کہ اگر مجھے مال ملے تو میں بھی یوں ہی عیش اڑاؤں اور دنیا کے مزے لوٹوں۔فرمایا کہ یہ دونوں گناہ میں برابر ہیں۔ یہ برابری محض نیت کی وجہ سے ہوئی۔

دو عجیب وغریب چیزیں

بعض اولیائے کرام کے مطابق دو چیزیں عجیب وغریب ہیں: ایک توبہ اور دوسری نیت۔

نیت کا کام ہے معدوم چیز کو موجود بنا دینا‘ مثلاً ہم نے کوئی عمل نہیں کیا مگر نیت کر لی تو ثواب ملے گا۔دوسری چیز توبہ ہے جو موجود کو معدوم کر دیتی ہے‘ کیوں کہ انسان خواہ ستر (۷۰) برس تک گناہ کرتا رہے‘ جب بارگاہ الٰہی میں ایک سجدہ کیا اور معافی مانگی تو سب یک قلم معاف۔گناہوں کے ایک بے شمار ذخیرہ کو ایک مخلصانہ توبہ نے معدوم کر ڈالا۔ یہ دونوں نعمتیں خدا تعالیٰ نے اہل ایمان کو عطا کی ہیں۔فللّٰہ الحمد حمدًا کثیرا

ریا اور بری نیت

جس طرح صفت اخلاص اور نیک نیت سے متصف ہونے سے انسان کو اعلیٰ مرتبہ نصیب ہوتا ہے‘ اسی طرح سے ریا اور بری نیت کی وجہ سے انسان اسفل سافلین کے درجے میں جا گرتا ہے‘ کیونکہ عمل کا اصل باعث اخلاقی عنصر ہے اور وہی رب تعالیٰ سبحانہ کی نظر کا محور ہے (یعنی اللہ تعالیٰ اسی اخلاقی عنصر کو دیکھتے ہیں‘ عمل کا درجہ ثانوی ہے)۔حضرت ابوبکر صِدّیق ؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ’’جب دو مسلمان تلواریں سونت کر آمنے سامنے آتے ہیں (اور نتیجے میں ایک قتل ہو جاتا ہے) تو قاتل اور مقتول دونوں دوزخی ہیں‘‘۔ مَیں نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! قاتل کا دوزخی ہونا تو سمجھ میں آ گیا‘ لیکن مقتول کیونکر دوزخی ہوا؟ آپ نے فرمایا: ’’مقتول بھی تو اپنے مدِمقابل کو قتل کرنے پر حریص تھا۔‘‘ (بخاری ومسلم)

اللہ سبحانہ تعالیٰ حساب تو نیتوں پر لیں گے خواہ وہ ظاہر کرے یا اسے چھپائے۔فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۭ﴾

(البقرہ:۲۸۴)

’’خواہ تم اپنے دل کی بات چھپاؤ یا اسے ظاہر کرو اللہ تعالیٰ تم سے حساب ضرور لیں گے۔‘‘

اسی حکم الٰہی کو نبی اکرم ﷺ نے حدیث قدسی سے واضح فرمایا۔حضرت عبداللہ بن عباس ؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی كَتَبَ الْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ ثُمَّ بَيَّنَ ذٰلِكَ۔ فَمَنْ هَمَّ بِحَسَنَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ عِنْدَهُ حَسَنَةً كَامِلَةً ۔ وَاِنْ هَمَّ بِهَا فَعَمِلَهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ عَشْرَ حَسَنَاتٍ اِلٰى سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ اِلٰى اَضْعَافٍ كَثِيْرَةٍ۔

وَاِنْ هَمَّ بِسَيِّئَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ حَسَنَةً كَامِلَةً. وَاِنْ هَمَّ بِهَا فَعَمِلَهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ سَيِّئَةً وَاحِدَةً)) (رواه البخاری و مسلم)

’’اللہ تعالیٰ نے نیکیوں اور بدیوں کو لکھا اور ہر ایک کو واضح کر دیا۔ پھر جس کسی نے نیکی کا ارادہ کیا لیکن اس نیکی پر عمل نہیں کیا تو اللہ تعالیٰ اس کے نامۂ اعمال میں ایک نیکی لکھ دیتے ہیں۔ اور اگر نیکی کا ارادہ کر کے وہ نیکی بھی کر گزرے تو اسے ایک نیکی کے بدلے دس سے لے کر سات سو گنا بلکہ اس سے بھی کئی گنا زیادہ اجر عطا فرماتے ہیں۔ (یعنی اخلاص میں جتنی قوت ہوگی اتنا ہی اجر زیادہ ہوگا) لیکن اگر برائی کا ارادہ کیا لیکن وہ برائی نہیں کی تو اس (اجتناب) پر بھی ایک کامل نیکی اس کے نامۂ اعمال میں لکھی جائے گی۔ اور اگر بدی کا ارادہ کر کے وہ گناہ بھی کر لیا تو صرف ایک گناہ ہی لکھا جائے گا۔‘‘

یعنی اگر بُرائی کا ارادہ کر کے خوفِ خدا کی وجہ سے برائی سے باز رہا تو عند اللہ یہ ایک نیکی گنی جائے گی۔ مزید برآں حضورﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ تَجَاوَزَ عَنْ اُمَّتِيْ مَا حَدَّثَتْ بِهٖ اَنْفُسَهَا))(متفق علیه)

’’اللہ تعالیٰ نے میری امت کے لوگوں کے دلوں کے وسوسوں کو معاف فرما دیا ہے۔‘‘

ریا اور دکھاوے کا اثر یہ ہے کہ وہ بندے اور خدا کے درمیان حجاب بن جاتا ہے اور اسے حیوانوں کے زمرے میں لا شامل کرتا ہے۔ پھر اس کے نفس کا تزکیہ نہیں ہو پاتا۔ اس کا کوئی عمل مقبول نہیں ہوتا‘ کیونکہ دکھلاوے کے کام کرنے والے کی نہ کوئی رائے ہوتی ہے نہ اس کا کوئی عقیدہ ہوتا ہے‘ بلکہ وہ ’’گرگٹ‘‘ کی طرح ہوتا ہے کہ رنگ بدلتا رہتا ہے اور ہوا کے رخ پر چلتا ہے۔ عمل کی پختگی اس سے زائل ہو جاتی ہے۔ ریا کا مطلب ہے عبادات کے ذریعے جاہ و منزلت کا طلب کرنا۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس سے بچنے اور اسے ترک کرنے کا صریحاً حکم فرمایا ہے‘ کیونکہ اس سے انفرادی اور اجتماعی برائیاں پھیلتی ہیں۔ فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ يَمْكُرُوْنَ السَّيِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۭ وَمَكْرُ اُولٰۗىِٕكَ هُوَ يَبُوْرُ ⑩﴾ (فاطر)

’’اور جو لوگ بُرائیوں کے داؤ گھات میں لگے رہتے ہیں‘ ان کے لیے سخت تر عذاب ہے۔ اور ان کا یہ مکر برباد ہو جائے گا۔‘‘

جو لوگ بُرائی کے مکر کرتے ہیں یہی اہل الریا ہیں اور ریا منافقین کی صفت ہے جن کا مبدا

و معاد پر ایمان نہیں اور نہ ہی وہ صالح عقیدہ پر یقین رکھتے ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتا ہے:

﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَھُوَ خَادِعُھُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَاۗءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ١٤٢؁﴾ (النساء)

’’بے شک یہ منافقین اللہ سے دھوکہ بازی کرتے ہیں جب کہ اُس نے انہیں دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ اور جب نماز میں کھڑے ہوتے ہیں تو بددلی سے‘ محض لوگوں کو دکھانے کے لیے کھڑے ہوتے ہیں‘ اور اللہ کو یاد نہیں کرتے مگر بہت تھوڑا۔‘‘

عنقریب اللہ تعالیٰ اس دھوکا دہی کا پردہ فاش کر دے گا اور یہ چھپانا اس آدمی کے لیے باعث ذلت و رسوائی بنے گا۔ دکھلاوے کے لیے دھوکا دینے والے کی جگ ہنسائی ہوگی اور یہی اس کے دکھلاوے کی سزا ہوگی۔ حضورﷺ نے فرمایا: ((مَنْ سَمَّعَ سَمَّعَ اللّٰهُ بِهٖ وَمَنْ رَائٰى رَائَى اللّٰهُ بِهٖ)) ’’جس نے دکھلاوے کے لیے کام کیا اللہ تعالیٰ یہ کام اس کے لیے باعث رسوائی بنا دے گا۔ اور جس نے کوئی نیک کام اس نیت سے کیا کہ لوگوں کو معلوم ہو اور وہ اس کی عزت کریں تو اللہ تعالیٰ ایسے اسباب فرما دیں گے کہ لوگوں پر واضح ہو جائے گا کہ اس کی اصل نیت کیا تھی۔‘‘

ریا شرک ہی کی ایک قسم ہے‘ جس سے عمل ضائع ہو جاتا ہے۔ محمود بن لبیدؓ سے مروی ہے کہ نبی مکرمﷺ نے فرمایا: ’’میں تمہارے بارے میں جس چیز سے سب سے زیادہ ڈرتا ہوں وہ شرک اصغر ہے‘‘۔ صحابہؓ نے پوچھا: یارسول اللہﷺ! یہ شرک اصغر کیا ہوتا ہے؟ فرمایا: ’’ریا۔ جب قیامت کے روز لوگوں کو ان کے اعمال کا بدلہ دے دیا جائے گا تو اللہ تعالیٰ (دکھلاوے کے لیے کام کرنے والوں کو) فرمائے گا: جن لوگوں کو تم دنیا میں دکھا کر کام کرتے تھے‘ ان کے پاس جاؤ‘ ذرا دیکھو تو تمہیں ان کے ہاں سے کوئی بدلہ ملتا ہے!‘‘ (رواہ احمد)

بعض لوگ دکھلاوے کے لیے ایسے کام کرتے ہیں کہ لوگوں میں ان کا خوب چرچا ہوتا ہے لیکن ان کا کام چونکہ خلوص پر مبنی نہیں ہوتا اس لیے اس پر نیک اثر بھی مرتب نہیں ہوتا۔ امام مسلمؒ نے حضرت ابوہریرہؓ سے حدیث نقل کی ہے‘ فرماتے ہیں‘ مَیں نے رسول اللہﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ قیامت کے روز سب سے پہلے جس شخص کا فیصلہ ہوگا وہ شہید ہوگا۔ اسے دربارِ خداوندی میں حاضر کیا جائے گا۔ پھر اس سے سوال ہوگا: تو نے دنیا میں کیا کیا؟ وہ جواب

دے گا: مَیں نے تیری راہ میں جہاد کیا اور شہید ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: تو نے جھوٹ بولا ہے‘ تو نے جنگ اس لیے لڑی تھی کہ لوگ کہیں کہ فلاں بڑا بہادر تھا۔ چنانچہ لوگوں نے تیری تعریف کر دی (اب ہمارے ہاں تیرے لیے کچھ نہیں)۔ پھر اس کے متعلق فیصلہ صادر ہوگا اور وہ منہ کے بل دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔ پھر دوسرا شخص لایا جائے گا۔ اس نے علم سیکھا اور سکھایا ہوگا اور قرآن کا قاری ہوگا۔ اسے اللہ تعالیٰ کی نعمتیں یاد دلائی جائیں گی‘ وہ ان سب کا اعتراف کرے گا۔ پھر سوال ہوگا کہ ان نعمتوں کے بدلے میں تو نے کیا کیا؟ وہ کہے گا: میں نے علم سیکھا اور سکھایا اور تیرے قرآن کی تلاوت کی۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: تُو نے جھوٹ بولا ہے۔ تُو نے اس لیے علم سیکھا تھا کہ لوگ تجھے عالم کہیں۔ پس یہ کچھ کہا گیا‘ اور تُو نے قرآن اس لیے پڑھا تھا کہ لوگ تجھے قاری کہیں اور یہ بھی کہا گیا (اب ہمارے پاس اس کا کچھ اجر نہیں)۔ پھر اس کو حسب الحکم منہ کے بل دوزخ میں جھونک دیا جائے گا۔ پھر تیسرا شخص لایا جائے گا۔ اسے دنیا میں اللہ تعالیٰ نے رزق کی وسعت عطا فرمائی ہوگی۔ ہر قسم کا مال و دولت اسے میسّر تھا۔ اللہ تعالیٰ اسے اپنی نعمتیں یاد دلائیں گے‘ وہ ان کا اعتراف بھی کرے گا۔ پھر سوال ہوگا: ان نعمتوں کے بدلے میں دنیا میں تو نے کیا کیا؟ وہ جواب دے گا: میں نے تیری رضا کے لیے ہر نیک کام کیا اور ان کاموں میں مال خرچ کیا۔ ارشاد ہوگا: تو جھوٹا ہے۔ تو نے خرچ اس لیے کیا تھا کہ لوگ کہیں کہ فلاں بڑا سخی ہے۔ پس یہ کچھ کہا گیا (اب تیرے لیے ہمارے پاس کچھ نہیں)۔ پھر اسے حسب الحکم منہ کے بل دوزخ میں جھونک دیا جائے گا۔ (سنن نسائی)

حدیثِ مذکورہ سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اگر لوگ تعریف کریں گے تو عمل اکارت جائے گا۔ اگر کوئی کام نیک نیت اور اخلاص سے کیا جائے اور لوگوں نے اس کی تعریف کی (اور اس تعریف پر اس کا اپنا مقصد نہیں تھا) تو اس کا عمل ضائع نہیں ہوگا‘ خواہ ان کی یہ تعریف اسے بھلی ہی معلوم کیوں نہ ہو۔

امام ترمذیؒ نے حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت کی ہے‘ ایک شخص نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ! ایک شخص لوگوں سے چھپا کر کوئی عمل کرتا ہے لیکن لوگوں کو اس کی اطلاع ہو جاتی ہے اب وہ شخص اس بات پر خوش ہوتا ہے (تو کیا اس عمل کا اسے ثواب ملے گا)؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’اسے دو ثواب ملیں گے‘ ایک تو چھپانے کا ثواب اور ایک ظاہر ہونے کا ثواب۔ بلکہ

لوگوں کی یہ تعریف ایک قسم کی بشارت ہے جو دنیا میں اسے مل گئی۔‘‘

امام مسلمؒ نے حضرت ابوذر غفاری ؓ سے روایت کی ہے‘ میں نے پوچھا: یا رسول اللہ ﷺ! ’’ایک شخص نیک عمل کرتا ہے اور لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ’’یہ مومن کے لیے دنیا میں ہی بشارت ہے۔‘‘

زندگی کا ہر لمحہ عبادت

ہم اپنی زندگی میں بہت سے عمل بلا جھجک کرتے ہیں لیکن وہ رائیگاں جاتے ہیں۔ جو عمل نیت اور ارادے کے بغیر کیا جائے وہ عمل نہیں بلکہ فعل کہلاتا ہے۔ اس کا کوئی اجر نہیں ہوتا‘ کیونکہ یہ اعمال ہماری عادتیں ہیں۔ افعال اور اعمال میں فرق ہے۔ جو کام بغیر ارادے کے کیے جائیں وہ افعال و عادات ہیں اور جو کام ارادے کے ساتھ کیے جائیں وہ اعمال ہیں۔ فعل پر اجر نہیں چونکہ وہ عادت ہے‘ عمل کا اجر ہے اس لیے کہ وہ عبادت ہے۔

اگر ہم چاہیں تو زندگی کا ہر لمحہ عبادت بنا لیں‘ لیکن افسوس کہ بالعموم ہم نے ساری زندگی بےکار کر رکھی ہے۔ ہماری زندگی کے بہت سے لمحے رائیگاں جا رہے ہیں۔ ہم روز کھانا کھاتے ہیں مگر ایسی نیت نہیں کرتے جس سے ہمارا کھانا بھی عبادت میں بدل جائے‘ حالانکہ یہ ممکن ہے۔ اگر ہم یہ نیت کر کے کھائیں کہ اس کھانے سے اللہ تعالیٰ کی عبادت و اطاعت اور دینِ مبین کی خدمت کے لیے میرے جسم کو قوت میسّر آئے تو جو کچھ رزق حلال میں سے ہم کھائیں گے‘ اس کا ایک ایک لقمہ عبادت بن جائے گا۔

اسی طرح نیت نیند کو بھی عبادت بنا دیتی ہے۔ اہل اللہ کی نیند دوسرے لوگوں کی نفلی عبادت سے افضل ہے‘ کیونکہ وہ جب سوتے ہیں تو اس نیت سے سوتے ہیں کہ جسم کو آرام ملے تاکہ صبح تازہ دم ہو کر پھر اللہ کے دین کی خدمت بجا لا سکیں‘ عبادت و اطاعت کر سکیں‘ فرائضِ دین قوت کے ساتھ انجام دے سکیں۔ پس اس نیت سے سونے سے بیدار ہونے تک ان کا ہر لمحہ عبادت بن جاتا ہے۔

گویا نیت کی قوت اتنی ہے کہ اُس نے نیند‘ چلنے پھرنے‘ اُٹھنے بیٹھنے اور کھانے پینے کو بھی عبادت بنا دیا۔ ہم اپنی زندگی میں بے شمار عمل کرتے ہیں‘ جن میں نیت ہی نہیں ہوتی۔ ایسے افعال اور عادات ردّی کی ٹوکری میں چلے جاتے ہیں۔ (باقی صفحہ 66 پر)

موت: ایک اٹل حقیقت

حافظ محمد اسد ٭

موت ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کسی کو فرار ممکن نہیں۔ دنیا میں بیشتر لوگ اس کائنات کے بہت سے حقائق کو نہیں مانتے اور غیب کی باتوں پر ایمان نہیں رکھتے۔ یہ مادی چیزوں کو جو ان کے مشاہدے میں آتی ہیں' ان کو ہی مانتے ہیں' اور جو چیزیں حواسِ خمسہ سے ماوراء ہیں وہ ان کے لیے قابلِ قبول نہیں۔ وہ جو اقبال نے کہا تھا ؎

خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر
مانتا پھر کوئی اَن دیکھے خدا کو کیوں کر؟

چنانچہ ان کے نزدیک جو شے دائرۂ نظر سے غائب ہے' اس کا کوئی وجود نہیں۔ یہ سیکولر ذہنیت کی علامت ہے۔ اس فکری گمراہی کے باوجود دنیا کا کوئی شخص خواہ وہ کسی مسلک' کسی مذہب اور نقطہ نظر کا حامل ہو' موت کا انکار نہیں کر سکتا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ہر ایک سے خود کو منوا کر ہی رہتی ہے۔ قرآن حکیم میں اس حقیقت کو تین مقامات پر بیان کیا گیا ہے:

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۭ﴾ (آلِ عمران:۱۸۵' الانبیاء:۳۵' العنکبوت:۵۷)

''ہر جان کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔''

جب بچہ دنیا میں آتا ہے تو اس کے ایک کان میں اذان اور دوسرے میں اقامت کہی جاتی ہے۔ گویا یہ بچے کے لیے اعلان ہے کہ تیری زندگی کی اذان اور اقامت ہو چکی ہے۔ چنانچہ جتنا وقت اقامت اور نماز کے دوران ہوتا ہے بس اتنی ہی ہر شخص کے لیے زندگی کی مہلت ہے۔

یہ حقیقت ہمیشہ ذہن میں مستحضر رہنی چاہیے کہ یہ دنیا محض کھانے پینے' جنسی خواہش پوری کرنے اور زیادہ سے زیادہ آسائشیں حاصل کرنے کے لیے نہیں ہے' بلکہ ہماری زندگی کا ایک بڑا اور عظیم مقصد ہے جو خالقِ کائنات نے اس طرح بیان کیا ہے:

٭ نقیب اسرہ' ملیر' کراچی

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝۵۶﴾ (الذاریات)

''میں نے جنوں اور انسانوں کو اسی لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔''

اس امر کو پیش نظر رکھا جائے تو انسان کے سارے اعمال میں درستگی پیدا ہو جائے گی۔ دنیا میں اپنے عمل سے بندگی کا حق ادا کرنا ہر انسان پر لازم ہے۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا ۝۷۲﴾ (بنی اسرائیل)

''اور جو شخص بنا رہا اس دنیا میں اندھا وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا اور بڑا گم راہ کردہ ہوگا۔''

مفسرین فرماتے ہیں یہاں اندھا ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ دنیا میں حق کو دیکھنے سے محروم رہا' چنانچہ آخرت میں بھی نجات کا راستہ نہیں دیکھ سکے گا۔

یہ یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ یہ دنیا فانی ہے اور ایک دن ختم ہو جائے گی۔ اس دنیا میں ہر انسان ایک امتحان گاہ میں ہے' اس کا امتحانی پرچہ اس کے اعمال ہیں۔ جو عمل بھی وہ کرے گا یا کرائے گا' وہ سب اس پرچہ میں درج ہوتا رہے گا۔ گویا ہر شخص اپنی زندگی کی کتاب خود لکھ رہا ہے۔ اس کی آنکھ بند ہونے کے ساتھ ہی یہ کتاب بھی بند کر دی جائے گی اور جب انسان اپنے ربّ کے سامنے پیش ہوگا تب یہ کتاب اس کے ہاتھ میں یہ کہہ کر دے دی جائے گی کہ:

﴿اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۭ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ۝۱۴﴾ (بنی اسرائیل)

''لو پڑھ لو اپنا اعمال نامہ! آج تم خود اپنا حساب لینے کے لیے کافی ہو۔''

اس آیت مبارکہ کی روشنی میں ہر شخص کو اپنا جائزہ لینا چاہیے کہ وہ اپنی زندگی کی کتاب میں کیا لکھ رہا ہے۔ یہ قلم وقرطاس دونوں اس کے چھوٹے بڑے تمام اعمال کو کھول کر بیان کر دیں گے۔ اُس وقت کوئی اپنے اس اعمال نامہ سے انحراف بھی نہیں کر سکے گا' زبان پر مہر لگا دی جائے گی اور اس کے اعضاء وجوارح کلام کریں گے۔ از روئے قرآن حکیم:

﴿اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝۶۵﴾ (یٰسٓ)

''آج کے دن ہم ان کے منہ پر مہر لگا دیں گے' اور ان کے ہاتھ ہم سے باتیں کریں گے' اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے کہ وہ کیا کمائی کیا کرتے تھے۔''

امام غزالی رحمہ اللہ نے آخرت کی زندگی کے بارے میں فرمایا ہے: ''اگر زمین اور آسمان

کے درمیان رائی کے دانے بھر دیے جائیں اور ہر ایک ہزار سال بعد ایک پرندہ آئے اور اس کا ایک دانہ کھائے‘ پھر ہزار سال بعد آئے اور دوسرا دانہ کھائے‘ اسی طرح کھاتا جائے تو ایک وقت آئے گا کہ سارے دانے ختم ہو جائیں گے لیکن آخرت کی زندگی پھر بھی ختم نہیں ہوگی۔‘‘

وہاں انسان کو ایک لامتناہی زندگی گزارنی ہوگی۔ اگر اعمال اچھے نہ ہوئے تو اتنی طویل زندگی بھلا کیونکر گزرے گی۔ یہ دنیا تو دار العمل ہے‘ یہاں ہر شخص اپنے حصے کی کھیتی اپنے طریقے اور اپنے انداز سے بو رہا ہے۔ جو کچھ یہاں بوئے گا وہ وہاں جا کر کاٹے گا۔ یہ وہ سچائی ہے جو انسان کی نظروں سے اکثر اوجھل رہتی ہے اور اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ ہستی انسان کی نظر سے دور ہوتی ہے جس نے اسے دنیا میں بھیجتے وقت کہہ دیا تھا:

﴿فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۳۸﴾ (البقرة)

’’پھر اگر میری طرف سے کوئی ہدایت تمہیں پہنچے‘ تو جو لوگ میری ہدایت کی پیروی کریں گے ان کو نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ کسی غم میں مبتلا ہوں گے۔‘‘

ہدایت سے محرومی انسان کو راندۂ درگاہ کر دیتی ہے۔ اس کے اندر فکری اور عملی گمراہیاں ڈیرے ڈال لیتی ہیں۔ اسے یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے! وہ جب اپنے خالق و مالک کو بھلا دیتا ہے تو پھر اس کا خالق اسے اس کی ذات سے ہی بیگانہ کر دیتا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۱۹﴾ (الحشر)

’’اور تم ان جیسے نہ ہو جانا جو اللہ کو بھول بیٹھے تھے تو اللہ نے انہیں خود اپنے آپ سے غافل کر دیا۔ یہی ہیں جو نافرمان ہیں۔‘‘

اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اس بات سے غافل ہو گئے کہ خود ان کی جانوں کے لیے کون سی بات فائدے کی ہے اور کون سی بات نقصان کی ہے۔ یوں غفلت کے عالم میں ایسے کام کرتے رہے جو انہیں تباہی کی طرف لے جانے والے تھے۔ اللہ تعالیٰ سے غافل ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بندے کو اس بات کا شعور ہی نہیں رہتا کہ وہ دنیا میں کیوں آیا اور اسے کیا کرنا چاہیے!

اسی کو غفلت اور دھوکا کہتے ہیں اور قرآن نے اس دنیا کو دھوکے کا گھر (دار الغرور) کہا

ہے۔ اس دنیا سے صرف اَن پڑھ ہی دھوکا نہیں کھاتے بلکہ پڑھے لکھے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی فریب کھا جاتے ہیں۔ وہ دنیا میں ایسے مست ہو جاتے ہیں کہ نہ عبادات کی ادائیگی کا ہوش رہتا ہے اور نہ معاملات میں ہی کھرے ہوتے ہیں۔ اپنے معاشرے پر اگر غور کریں تو بالعموم ہر شخص اسی دنیا کو جنت بنانے میں مصروفِ عمل نظر آئے گا۔ میرا گھر‘ میرا کاروبار‘ امیر ترین گھرانے میں رشتے کی خواہش‘ بچوں کے مستقبل کی فکر‘ بس یہی ہمارے فکر و عمل کا محور ہے‘ چاہے ہماری آخرت برباد ہو جائے۔ مادی لحاظ سے ایک بہتر زندگی گزارنا کوئی بری بات نہیں ہے۔ اللہ تو خود یہی چاہتا ہے کہ میرے بندے دنیا میں میری عطا کی ہوئی نعمتوں سے فیض یاب ہوں۔ رنگ و نور کی یہ دنیا اللہ نے انسان کے لیے ہی تو سجائی ہے‘ بس اتنا خیال رہے کہ یہاں کی ہر شے انسان کو تصرف اور برتنے کے لیے دی گئی ہے۔ کسی بھی شے پر ملکیت کا حق نہیں دیا ہے کہ اس پر قبضہ جما کر بیٹھ جاؤ اور اپنے منعم کو فراموش کر دو۔ اس فانی دنیا کی بے ثباتی کا احساس ہمہ وقت قلوب و اذہان میں مستحضر رہنا چاہیے۔ بقولِ اکبر الٰہ آبادی ؎

دنیا میں ہوں‘ دنیا کا طلب گار نہیں ہوں
بازار سے گزرا ہوں‘ خریدار نہیں ہوں!

اس نقطہ نظر کے تحت زندگی گزارنا اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے۔ انسان کو سوچنا چاہیے کہ آخر وہ اس دنیا کی لذتوں‘ عیش کوشی اور نفسانی خواہشات کی حلاوتوں سے کب تک آسودہ ہو سکتا ہے! اس دنیا کی زندگی کا ہر راستہ موت کی وادی میں ہی جا کر ختم ہوتا ہے۔ آگے ایک ایسی دیوار آ جاتی ہے کہ اس کے دوسری طرف جانے کا کوئی اور راستہ ہی نہیں ہے۔ دراصل یہ موت ہی ایک مقررہ مدت تک ہماری حفاظت کرتی ہے‘ جس کے ختم ہوتے ہی وہ ہمارا خاتمہ کر دے گی۔ روزِ ازل سے اللہ تعالیٰ کا یہی قانون چل رہا ہے اور اس دنیا کی بساط لپیٹے جانے تک اسی طرح چلتا رہے گا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار!

اللہ کے رسول ﷺ نے ایک موقع پر یوں ارشاد فرمایا:

يَقُولُ ابْنُ آدَمَ: مَالِي مَالِي‘ وَهَلْ لَكَ مِنْ مَالِكَ إِلَّا مَا تَصَدَّقْتَ فَأَمْضَيْتَ أَوْ أَكَلْتَ فَأَفْنَيْتَ‘ أَوْ لَبِسْتَ فَأَبْلَيْتَ

(سنن الترمذی: ح ۲۳۴۲)

’’ابن آدم کہتا ہے کہ میرا مال‘ میرا مال! حالانکہ تمہارا مال صرف وہ ہے جو تم نے صدقہ کر دیا اور اسے آگے چلا دیا‘ اور کھایا اور اسے ختم کر دیا‘ یا پہنا اور اسے پرانا کر دیا۔‘‘

اللہ سبحانہ وتعالیٰ انسان کو بار بار پلٹنے کا موقع عنایت فرماتے ہیں‘ کبھی کوئی تکلیف دے کر‘ کبھی بیماری میں مبتلا کر کے کہ شاید میرا بندہ میری طرف لوٹ آئے‘ توبہ کر لے۔ لیکن جب انسان اپنے نفس کو ہی معبود بنا لے اور اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے احکامات کو پس پشت ڈال دے تو پھر اللہ تعالیٰ اس کے دل پر مہر لگا دیتا ہے۔ اب وہ حق کی بات سن کر بھی اس کا اثر نہیں لیتا۔ پھر اس کی روش شیطانِ لعین کی سی ہو جاتی ہے‘ جیسے اس مردود نے کہا تھا کہ (معاذ اللہ!) میرے رب تُو نے مجھے گم راہ کر دیا جب کہ مَیں تو سیدھے راستے پر تھا۔

لہٰذا ہمیں اپنی روش کو بدلنا ہوگا اور اس دھوکے کے گھر (دنیا) کی حقیقت کو سمجھنا ہوگا۔ اپنی توجّہ کا مرکز ومحور آخرت کو بنانا ہوگا۔ قرآن کریم جو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی طرف سے آخری پیغام ہدایت ہے‘ سمجھ کر پڑھنا ہوگا۔ جب ہم اس کو سمجھ کر پڑھیں گے تو اندازہ ہوگا کہ ہمیں آخرت کی تیاری کا حکم دیا گیا ہے‘ جہنم سے ڈرایا گیا ہے اور خبردار کیا گیا ہے کہ یہ دنیا دار الفنا ہے۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے سورۃ الصف میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۱۰ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۱۱ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝۱۲ وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ۭ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۳﴾

’’اے ایمان والو! کیا مَیں ایسی تجارت پر تمہاری رہنمائی کروں جو تمہیں دردناک عذاب سے بچا لے۔ تم اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) پر ایمان رکھو اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کرو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔ وہ تمہارے گناہ بخش دے گا اور تمہیں ان باغوں میں داخل فرمائے گا جن کے نیچے نہریں رواں ہیں اور پاکیزہ رہائش گاہوں میں جو ہمیشہ رہنے کے باغوں میں ہیں۔ یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔ اور ایک دوسری (نعمت تمہیں دے گا) جسے تم پسند کرتے ہو۔

(وہ) اللہ کی مدد اور جلد آنے والی فتح (ہے)۔ اور (اے حبیب ﷺ!) مسلمانوں کو خوشخبری سنا دو۔‘‘

دنیا میں کھانے پینے‘ پہننے اور دیگر ضروریات کے لیے کسب مال کی ضرورت ہوتی ہے جسے بہت سے لوگ تجارت کے ذریعہ حاصل کرتے ہیں۔ اس میں اکثر لوگ بہت زیادہ انہماک کر لیتے ہیں‘ بایں طور کہ موت کے بعد کے حالات اور آخرت کے اجر وثواب پر دھیان ہی نہیں دیتے۔ مال کی زیادہ سے زیادہ طلب میں ایسے لگتے ہیں کہ آخرت میں کام دینے والے اعمال کو بھول ہی جاتے ہیں۔ تجارت میں دونوں چیزیں دیکھی جاتی ہیں۔ اوّل یہ کہ نفع ہو‘ دوسرے یہ کہ نقصان نہ ہو۔ یہاں بھی دوسری چیز کا زیادہ خیال رکھا جاتا ہے اور یہ مقولہ مشہور ہے کہ ’’دفع مضرت جلب منفعت سے بہتر ہے۔‘‘ لہٰذا مذکورہ بالا آیات میں عذاب سے نجات دینے کو پہلے بیان فرمایا جبکہ جنت میں داخلہ کی بشارت بعد میں دی گئی۔ جنت کے حوالے سے سورۃ الکہف میں فرمایا گیا:

﴿خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا ۝۱۰۸﴾

’’اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے‘ وہاں سے وہ جگہ بدلنا نہیں چاہیں گے۔‘‘

اور سورۂ فاطر میں اہل جنت کا یہ قول نقل فرمایا گیا ہے:

﴿اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُ ۝۳۴ الَّذِيْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ﴾

’’بیشک ہمارا پروردگار غفور ہے شکور ہے‘ جس نے اپنے فضل سے ہمیں رہنے کی جگہ میں اتارا۔‘‘

دنیا میں تقریباً ہر شخص مادی فائدے کے لیے تگ ودو کرتا ہے۔ اپنے معاملات سنوارنے اور ذرائع معاش کو بہتر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ البتہ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو دین اور دنیا دونوں کو سنوارتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے دنیا میں خیر سے نوازا اور آخرت میں بھی ان کے لیے خیر وبھلائی ہے‘ نیز انہیں آگ کے عذاب سے بھی تحفظ دیا۔

پاک ہے وہ ذات جس نے ہر ایک کے دل میں تمنائیں اور سب کے لیے عزم وارادہ پیدا کیا۔ وہ اپنی مرضی سے جو چاہے کرتا اور جسے چاہے چھوڑ دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی اور ارادہ سب پر بھاری ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۲۹﴾ (التکویر)

''اور اللہ ربّ العالمین کی مرضی کے بغیر تمہاری کوئی مرضی نہیں ہے۔''
لہٰذا جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے وہ ہو جاتا ہے اور جو نہیں چاہتا وہ نہیں ہوتا۔

موت اس دھرتی پر تمام مخلوقات کا آخری انجام ہے۔ اس دنیا میں ہر ذی روح کی انتہا موت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں پر بھی موت لکھ دی ہے چاہے وہ جبریل، میکائیل اور اسرافیل علیہم السلام ہی کیوں نہ ہوں، حتیٰ کہ ملک الموت (عزرائیل علیہ السلام) بھی موت کے منہ میں چلے جائیں گے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝٢٦ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۝٢٧﴾

(الرحمٰن)

''اس دھرتی پر موجود ہر چیز فنا ہو جائے گی۔ صرف تیرے پروردگار کی ذاتِ ذوالجلال و الاکرام باقی رہے گی۔''

موت دنیاوی زندگی کی انتہا جبکہ اُخروی زندگی کی ابتدا ہے۔ موت کے ساتھ ہی دنیاوی تکالیف اور آسائشیں ختم ہو جاتی ہیں۔ مرنے کے بعد میت یا تو عظیم نعمتیں دیکھتی ہے یا پھر دردناک عذاب۔ موت اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور تمام مخلوقات پر اس کا مکمل تسلط عیاں ہوتا ہے۔

﴿وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ ۝٦١﴾ (الانعام)

''اور وہی اپنے بندوں پر غالب ہے اور وہ تم پر نگہبان بھیجتا ہے، یہاں تک کہ جب تمہارے کسی ایک کو موت آتی ہے اسے ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے قبض کر لیتے ہیں اور وہ کوتاہی نہیں کرتے۔''

دنیا کی حقیقت انسان کے لیے ایک امتحان گاہ کی سی ہے۔ ہر انسان کو اپنے اعمال کے مطابق اس کا نتیجہ اچھا یا بُرا ملے گا۔ پھر انسان اپنی موت کو کیوں بھلا بیٹھا ہے؟ دنیا کے عیش و عشرت میں اتنا مشغول ہو گیا ہے کہ اس کو موت کی ذرا بھی فکر نہیں رہی۔ موت کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے، وہ کہیں بھی اور کبھی بھی آ سکتی ہے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا شمار عشرہ مبشرہ میں ہوتا ہے جن کو جنت کی خوشخبری دنیا ہی میں سنا دی گئی تھی، لیکن اس کے باوجود آپؓ کا یہ حال تھا کہ عذابِ قبر کے خوف سے اس قدر روتے کہ داڑھی تر ہو جاتی تھی۔

ہم جب بھی کوئی گناہ کرتے ہیں تو تین باتوں کو ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ اللہ دیکھ رہا ہے، فرشتے لکھ رہے ہیں اور موت آنی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ جتنا ہو سکے اللہ کی عبادت بندگی کے جذبہ کے ساتھ کریں۔ اچھے اعمال، اللہ کے بندوں کے ساتھ اچھا سلوک اور صلہ رحمی کا معاملہ کریں۔ ایسے میں امید ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں ہمیں کامیابی سے نوازے گا اور ہماری قبر کشادہ اور روشن کر دی جائے گی۔ منکر و نکیر کے سوالات ہمارے لیے آسان کر دیے جائیں گے۔ اس کے برعکس اگر اعمال بُرے ہوئے تو انسان پر قبر تنگ کر دی جائے گی جس میں اندھیرا اور گھٹن ہو گی۔ دوزخ کی طرف سے ایک دروازہ کھول دیا جائے گا جس سے وہاں کا منظر نظر آئے گا۔ جہنم کا لباس پہنایا جائے گا۔ قبر دوزخ کا ایک گڑھا بن جائے گی اور قیامت تک کا عرصہ اس پر طویل ہوتا چلا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہم سب مسلمانوں کو کہنے سننے سے زیادہ عمل کرنے کی اور موت سے پہلے اُس اُخروی زندگی کی تیاری کی توفیق عطا فرمائے جس کا کوئی اختتام نہیں ہے۔ آمین!

❁❁❁

بقیہ: اَعمال میں اِخلاص

ان کا نامہ اعمال میں کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ صرف نیت کا مسئلہ اگر سمجھ آ جائے تو پوری زندگی بدل جائے اور ہمارا ہر ہر لمحہ عبادت بن جائے۔ لہٰذا جو کام بھی کرنے لگیں تو یہ دیکھیں کہ آیا یہ کام اللہ تعالیٰ کی رضا کا ہے، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے امر کی متابعت و مطابقت میں ہے! یعنی اس کا تعین کر لیں کہ وہ کام اللہ کے حکم کے خلاف نہ ہو، کیونکہ ہر وہ کام جو مباحاتِ زندگی میں سے ہے اگر اللہ کے لیے اس کی نیت کر لی جائے تو وہ عادت نہیں رہے گی بلکہ عبادت ہو جائے گی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں اخلاص کی حقیقت اور اس کا نور نصیب فرمائے، اپنے مخلص بندوں کی جماعت میں شامل فرمائے اور اپنی رضا والی زندگی اور رضا والی موت نصیب فرمائے۔ آمین یا ربّ العالمین!

❁❁❁

حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ

ارسلان اللہ خان

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت میں مہاجرین اور انصار افضل ہیں۔ پھر مہاجرین کو انصار پر فضیلت حاصل ہے اور مہاجرین میں سے بھی عشرۂ مبشرہ کو فضیلت حاصل ہے۔ انہی عشرۂ مبشرہ میں سے ایک حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ آپؓ کا نامِ نامی طلحہ‘ کنیت ابو محمد تھی۔ والد کا نام عبید اللہ اور والدہ کا نام صعبہ تھا۔ آپؓ کا تعلق حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے قبیلے قریش کی شاخ بنو تیم سے تھا اور آپؓ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے رشتے دار تھے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرح آپؓ کا سلسلۂ نسب بھی چھٹی پُشت میں حضرت مرہ بن کعب پر جا کر نبی اکرم ﷺ سے جا ملتا ہے۔

آپؓ تجارت کے پیشے سے وابستہ تھے اور آپؓ کی روزانہ کی آمدن ایک ہزار دینار تھی۔ اس کے باوجود غذا‘ لباس وغیرہ کے معاملے میں سادگی ہی سے کام لیتے تھے۔ آپؓ کے والد قبل از اسلام فوت ہو گئے تھے جبکہ والدہ ماجدہ نہ صرف مشرف بہ اسلام ہوئیں بلکہ انہوں نے طویل عمر بھی پائی۔

حضرت طلحہؓ ہجرتِ نبویؐ سے چوبیس یا پچیس برس قبل پیدا ہوئے۔ آپؓ اوائل عمری میں ہی تجارت کی غرض سے شام جایا کرتے تھے۔ آپؓ قریش کے اُن گنے چُنے لوگوں میں تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ آپؓ اکثر کاروبار کے سلسلے میں شام کا سفر کرتے‘ جیسا کہ سورۃ قریش میں قُریشیوں کے سفر کا تذکرہ ہے۔ آپؓ کا قد میانہ بلکہ ایک حد تک پست‘ چہرے کا رنگ سرخ و سفید‘ بدن خوب گٹھا ہوا‘ سینہ چوڑا‘ پاؤں نہایت پُرگوشت تھے۔ آپؓ کا ایک ہاتھ غزوۂ اُحد میں شل ہو گیا تھا۔ آپؓ خاموش طبع تھے اور تجارت میں مشغول رہتے تھے۔

شام کے شہر بصرہ کے بازار میں جہاں تجارت کے لیے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی آمد و رفت کا سلسلہ رہتا تھا‘ وہیں ایک مرتبہ ایک گرجے میں ایک عیسائی راہب کو دیکھا جو سب سے پوچھ رہا تھا

کہ کیا کوئی یہاں مکہ سے آیا ہے؟ حضرت طلحہؓ نے فرمایا: ''جی ہاں! مَیں مکہ سے آیا ہوں۔'' اُس نے پوچھا: ''کیا احمد نبی ظاہر ہو چکے ہیں؟'' مَیں نے کہا: ''کون احمد؟'' کہنے لگا: ''ابنِ عبد اللہ ابنِ عبد المطلب —— ہماری کتاب کے مطابق یہی مہینہ ہے‘ جس میں اُن کا ظہور ہونا ہے‘ وہ آخری نبی ہیں‘ تم واپس جا کر فوراً اُن پر ایمان لے آؤ!'' حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مَیں نے واپس مکّہ آ کر لوگوں سے دریافت کیا کہ کیا میری غیر موجودگی میں کوئی غیر معمولی واقعہ رونُما ہوا ہے؟ لوگوں نے کہا: ہاں محمد بن عبد اللہ (ﷺ) نے نبوت کا دعویٰ کر دیا ہے اور ابو بکرؓ نے اُن کا دین قبول کر لیا ہے۔ حضرت طلحہ نے صِدیقِ اکبر سے مُلاقات کی تو اُنہوں نے کہا کہ محمد ﷺ اللہ کے سچے نبی ہیں اور اللہ کے سچے دین کی جانب بلاتے ہیں‘ تُم بھی اُن کی دعوت قبول کر لو۔ حضرت طلحہؓ نے اُنہیں عیسائی راہب کا واقعہ سنایا تو وہ بہت خوش ہوئے اور انہیں رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئے اور اس طرح حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ بھی اسلام کی دولت سے مالا مال ہو گئے۔ اس طرح حضرت طلحہؓ ان آٹھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ہیں جو ابتدائے اسلام میں اسلام کی دولت سے مالا مال ہو گئے۔

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کے بعد آپؓ کے چچا اور بڑے بھائی آپؓ اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے سخت دُشمن بن گئے اور آپ دونوں پر بہت سختیاں کیں‘ لیکن آپ دونوں کے پایۂ استقلال میں ہرگز جنبش نہ آئی۔ شروع میں والدہ بھی اسلام کی مخالف تھیں‘ لیکن اللہ کا ایسا کرم ہوا کہ بعد میں والدہ بھی مسلمان ہو گئیں اور صحابیہؓ ہونے کا شرف حاصل کر لیا۔

اسلام لانے کے بعد تیرہ برس تک آپ رضی اللہ عنہ اپنوں اور بیگانوں کا ظُلم برداشت کرتے رہے اور ہدفِ تضحیک اور نشانِ ملامت بنتے رہے۔ آپ ﷺ کی ہدایت کے مطابق اس نازک ترین دور میں بھی تبلیغِ دین فرماتے رہے۔ دارِ ارقم میں صحابہؓ کے ساتھ شامل رہتے۔ یہاں تک کہ کُفّار کا ظُلم و جبر حد سے بڑھ گیا اور ہجرت کا حکم نازل ہو گیا۔ مدینہ میں حضور ﷺ نے مواخات کے وقت حضرت اُبی بن کعب انصاری رضی اللہ عنہ کو اُن کا بھائی بنا دیا۔

اُحد کی لڑائی میں آپؓ نے حضور ﷺ کی ایسی حفاظت فرمائی کہ کسی اور کو یہ مقام حاصل نہ ہوا۔ جب میدانِ جنگ میں مسلمانوں میں بھگدڑ مچ گئی تھی اور آپ ﷺ پر کُفّار بالکل سامنے سے حملے کر رہے تھے‘ ایسے میں آپ ﷺ پر ہونے والے سارے وار حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ

اپنے جسم پر لیتے رہے۔ آپؓ نے آقا کریم ﷺ پر جاں نثاری کا وہ حق ادا کیا کہ جب بھی آپ ﷺ پر کیے گئے وار کو اپنے اوپر لیتے تو خوشی کا اظہار فرماتے کہ اپنے محبوب نبی ﷺ کو بچانے میں کامیاب ہوگیا۔ اسی جاں نثاری میں آپؓ کا تمام بدن زخموں سے چھلنی ہوگیا تھا اور ایک ہاتھ بھی شل ہوگیا تھا۔ اُحد کے دن میں اُن کی اس بہادری، جاں نثاری اور شجاعت پر دربارِ رسالت ﷺ سے اُنہیں ''خیر'' کا لقب ملا۔ حضرت ابوبکر صدیق ؓ کہتے تھے کہ غزوۂ اُحد تو طلحہ کا دن تھا۔ اسی طرح حضرت عُمر ؓ اُن کو 'صاحبِ اُحد' فرماتے تھے۔

غزوۂ خندق، بیعتِ رضوان، صلح حدیبیہ، خیبر اور فتح مکہ غرض آپؓ ہر موقع پر شریک رہے۔ حُنین کی لڑائی میں جب مسلمانوں کے قدم اُکھڑنے لگے تو اُس وقت نبی مکرم ﷺ کا یہ عاشق آگے بڑھا اور جانفشانی کا وہ مظاہرہ کیا کہ بارگاہِ نبوت سے ''طلحة الجواد'' کا لقب ملا۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر جب مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی تو حضرت طلحہ ؓ نے ایک خطیر رقم پیش کی، جس پر آپ ﷺ نے اُنہیں ''فیاض'' کا لقب عطا فرمایا۔

جنگِ جمل (۳۶ ہجری) کے دوران حضرت علی ؓ سے ملاقات کے بعد آپؓ حضرت علی ؓ کی مخالفت سے دست کش ہوگئے تھے۔ اس کے بعد اسلام کا یہ عظیم سپوت اپنے ہی لشکر میں چھپے ایک فتنہ پرور شخص مروان بن حکم کے تاک کر پھینکے گئے زہریلے تیر کی تاب نہ لا کر شہادت کے رُتبے پر فائز ہوگیا۔ اس وقت آپ ؓ کی عمر ۶۴ برس تھی۔ آپؓ کی شہادت پر حضرت علی ؓ زاروقطار روئے۔

خوفِ خدا، رسول اللہ ﷺ سے انتہائی درجے کی محبت، جود وسخا، شُجاعت اور انفاق فی سبیل اللہ حضرت طلحہ ؓ کی اعلیٰ خصوصیات تھیں۔ آپؓ اتنے سخی اور فیاض تھے کہ قبیلہ بنوتیم کا کوئی ایسا نادار نہ تھا کہ جس کی آپؓ نے حاجت روائی نہ فرمائی ہو۔ تنگ دستوں کو خادم دیتے، مقروضوں کا قرض ادا کرتے، بیواؤں کے نکاح کراتے اور غلاموں کی گردنیں چھڑاتے۔ اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ ؓ کو ہر سال دس ہزار درہم بھیجتے۔ ذی القرد میں ایک چشمہ تھا جو آپؓ نے بھاری رقم ادا کر کے مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا۔ طبیعت میں سادگی کا غلبہ تھا، البتہ بے خوفی اور بے باکی اس درجہ تھی کہ حق بات کہنے سے کبھی نہ ہچکچاتے۔ عتبہ بن ربیعہ کی صاحبزادی اُمِّ ربان کو بہت سے معزز، دولت مند، حسین اور ذہین افراد نے شادی کے پیغامات

دیے لیکن انہوں نے آپؓ کی انہی صفات کی وجہ سے حضرت طلحہ ؓ کو ترجیح دی۔ وجہ پوچھنے پر بتایا:

''مَیں طلحہؓ کے اوصافِ حمیدہ سے خوب واقف ہوں۔ وہ گھر آتے ہیں تو ہنستے ہوئے، باہر جاتے ہیں تو مُسکراتے ہوئے، کچھ مانگو تو بخل نہیں کرتے اور خاموش رہو تو مانگنے کا انتظار نہیں کرتے۔ کوئی کام کر دو تو شکر گزار ہوجاتے ہیں، خطا ہوجائے تو معاف کر دیتے ہیں۔''

حضرت طلحہ ؓ نے مختلف اوقات میں کم و بیش سات شادیاں کیں۔ آپؓ کے صاحبزادوں میں محمد، عمران، عیسیٰ، اسماعیل، اسحاق، زکریا، یعقوب، موسیٰ، یوسف اور چار صاحبزادیاں تھیں، جن کے نام اُمّ اسحاق، عائشہ، صعبہ اور مریم ہیں۔ آپؓ کے سب سے بڑے بیٹے محمد (ؓ) کو صحابی ہونے کا شرف حاصل تھا، وہ بھی آپؓ ہی کے ساتھ جنگ جمل میں شہید ہوگئے۔ آپؓ حجاز کے بڑے تاجروں میں شمار ہوتے تھے۔ آپؓ اپنی دولت اللہ کے راستے میں لٹاتے۔ یہی وجہ تھی کہ اپنے پیچھے لاکھوں دینار اور ایک بڑی جائیداد چھوڑی۔ آپ کا دسترخوان مہمانوں سے بھرا رہتا۔ پاکیزہ اخلاق کے حامل، دیانت دار اور سخی تھے۔ صلہ رحمی اور مہمان نوازی آپؓ کے اہم اوصاف تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے حضرت طلحہ ؓ کے لیے جو جملہ کہا وہ آپؓ کی عظمت کا مُنہ بولتا ثبوت ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص زمین پر شہید کو چلتا پھرتا دیکھنا چاہے وہ طلحہ بن عبیداللہ کو دیکھ لے۔'' رضی اللہ عنہ۔ ان کی قبر مبارک پر کروڑہا رحمتوں کا نزول ہو۔ (آمین ثم آمین!)

استفادہ:

(۱) سیر الصحابہؓ
(۲) ''الدین'' کا خصوصی شمارہ ''عشرہ مبشرہ''
(۳) الریاض المنضر فی مناقب العشرة
(۴) ترمذی اور ابنِ ماجہ میں موجود عشرہ مبشرہؓ کے ابواب

❀❀❀

اہلِ جہنّم کی چیخ و پکار اور آرزو

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

انسان خالقِ کائنات کی شاہکار تخلیق ہے جسے اس نے عقل وشعور دے کر اپنی پسند اور ناپسند کے کام بتا دیے ہیں۔ کچھ اچھائیاں اور بُرائیاں اس کی فطرت میں رکھ دی گئیں۔ ہر انسان جانتا ہے کہ سچ بولنا اچھا ہے اور جھوٹ بولنا غلط ہے‘ اسی طرح کسی کو ناحق تکلیف دینا یا قتل کرنا بُرا ہے اور ضرورت مند کی مدد کرنا مستحسن ہے۔ فطرت کی اس صلاحیت کو مزید واضح کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں کو دنیا میں بھیجا تاکہ وہ انسانوں کو اچھے اور برے کاموں سے آگاہ کریں۔ گویا ہر انسان دنیا کی زندگی میں سراسر امتحان میں ہے۔ یہاں بُرائیاں کرنے والے بھی ہیں اور اچھے کام کرنے والے بھی‘ مگر نہ اچھے کام کرنے والوں کو یہاں جزا ملتی ہے‘ نہ بُرائی کرنے والوں کو سزا۔ کسی کو برے کام کے بدلے میں اوّل تو سزا ملتی ہی نہیں‘ اگر ملتی بھی ہے تو وہ انصاف کے تقاضے پورے نہیں کرتی۔ اسی طرح جو لوگ اچھے کام کرتے ہیں‘ اکثر و بیشتر نہ ان کو بدلے میں خوشحالی ملتی ہے اور نہ وافر نعمتیں۔ ایسی صورتِ حال کا لازمی تقاضا ہے کہ کوئی ایسا وقت ہو جہاں عدل کی حکمرانی ہو اور ہر شخص کو اپنے نیک و بد اعمال کا بدلہ دیا جائے۔ عدل وانصاف کی یہ عدالت قیامت کو لگے گی جب سارے لوگ دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔ دُنیا کی یہ زندگی دارالعمل میں ہے اور موت کے بعد ایک دوسری زندگی ہوگی جس میں ہر شخص کو اس کے اعمال کی جزا ملے گی۔

دنیا کی زندگی میں بڑی کشش ہے۔ یہاں رشتہ دار اور دوست ہیں جن کے ساتھ پیار اور اخلاص کا تعلق ہے۔ یہاں مال متاع ہے جس سے انسان اپنے لیے مادّی فائدے حاصل کرتا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ زندگی موت کے ساتھ ختم ہو جائے گی۔ مرنے والے کسی صورت واپس نہیں آسکتے۔ جانے والا دارالعمل کو چھوڑ جاتا ہے اور دارالجزاء میں چلا جاتا ہے۔ اس

دنیاوی زندگی کے ساتھ انسان اس قدر مانوس ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے مہربان خالق کو بھول جاتا ہے اور وہ کام کرنے لگتا ہے جس سے اس کی فطرت اِبا کرتی ہے۔ وہ یہ بات بھی فراموش کر بیٹھتا ہے کہ ایک دن اُسے اپنے اعمال کا بدلہ پانا ہے۔ اگر وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ عقل وشعور سے کام لے تو وہ خود اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ یہ زندگی ایک امتحان ہے‘ جس میں لوگ کامیاب بھی ہوں گے اور ناکام بھی۔ کامیاب ہونے والوں کو وہ نعمتیں ملیں گی جن کا آج تصوّر بھی نہیں کیا جاسکتا جبکہ ناکام ہونے والے جہنّم کے انتہائی خوفناک عذابوں میں ڈالے جائیں گے۔ آخرت کی یہ زندگی کبھی ختم نہ ہوگی۔ کامیاب ہمیشہ آسائش میں رہیں گے جب کہ بدانجام ہمیشہ کے عذاب میں مبتلا رہیں گے۔

ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر بھیجتا رہا جو اپنے وقت کے لوگوں کو اچھے کاموں کی دعوت دیتے‘ بُرائیوں سے روکتے اور آخرت کا خوف دلاتے رہے۔ لیکن اکثر لوگوں نے ان کا مذاق اڑایا اور بُرائیوں میں مشغول رہے۔ گویا انہوں نے نہ انبیاء ورسل ؑ کا کہنا مانا نہ اپنے عقل وشعور سے کام لیا۔

اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ قیامت تک کے لوگوں کے لیے ہادی بنا کر بھیجے گئے اور ان کے ساتھ جامع اور کامل ضابطہ حیات یعنی قرآن مجید نازل کیا گیا۔ چونکہ آپ ؐ خاتم النّبیین ہیں اس لیے آپ ؐ کے ساتھ جو ضابطہ حیات یعنی قرآن مجید بھیجا گیا اب وہی حتمی ہے اور اس میں کسی طرح کی تبدیلی نہیں ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی حفاظت کا ذمہ بھی اللہ تعالیٰ نے خود لیا ہے۔ پہلے انبیاء کو دی گئی کتب ان کے وقت کے لیے موزوں تھیں جبکہ قرآن مجید کسی خاص وقت یا قوم کے لیے نہیں بلکہ قیامت تک کے انسانوں کے لیے ہے۔ گویا اب دنیا میں جو انسان ہیں یا جو آئندہ آئیں گے ان کی راہنمائی کے لیے یہی قرآن کافی ہے۔

دنیا کی زندگی میں جن لوگوں نے عقل وشعور اور فطرت کے تقاضوں سے کام نہیں لیا‘ بلکہ دنیاوی لذتوں میں کھو کر اپنے خالق کو بھول بیٹھے‘ گویا ع ’’بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست‘‘ جیسے طرزِ عمل کا مظاہرہ کیا اور ایمان بالآخرۃ سے غافل رہے وہ جہنّم کا ایندھن بنیں گے۔ اسی طرح جو لوگ ایمانیات کو تو جانتے ہیں مگر اس ناپائیدار زندگی میں نہ حقوق اللہ کا دھیان رکھا اور نہ ہی حقوق العباد کی ادائیگی کو اہمیت دی وہ بھی جہنّم کی سزا پائیں گے۔ جس طرح جنتی حیاتِ جاودانی

سے متمتع ہوں گے‘ اسی طرح دوزخی سدا کے عذاب میں رہیں گے۔

دوزخی اپنی بداعمالیوں کا نتیجہ آگ کی صورت میں پائیں گے۔ وہاں وہ چیخیں گے‘ چلّائیں گے اور اپنے گناہوں کا اعتراف کریں گے۔ اُن کا حال قرآن مجید میں اس طرح بیان ہوا ہے: ﴿فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ ۝١١﴾ (المؤمن) ’’(وہ کہیں گے کہ) ہم اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں تو کیا اس عذاب سے نکلنے کا کوئی راستہ ہے؟‘‘

جہنّمی جب عذاب میں مبتلا ہوں گے تو چاہیں گے کہ انہیں کچھ مہلت مل جائے۔ سورۂ ابراہیم میں اس کا نقشہ یوں کھینچا گیا:

﴿وَاَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَآ اَخِّرْنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ ؕ﴾ (آیت ۴۴)

’’(اے نبی ﷺ!) آپ لوگوں کو (اُس دن سے) خبردار کیجیے جس دن آئے گا ان پر عذاب تو کہیں گے وہ جنھوں نے ظلم کیا تھا: اے ہمارے مالک! تو ہمیں تھوڑی سی مدتِ مہلت عطا کر‘ تاکہ ہم قبول کریں تیری دعوت اور پیروی کریں پیغمبروں کی۔‘‘

دوزخی جب عذاب کی تکلیف پائیں گے تو تمنّا کریں گے کہ اگر انہیں جہنّم سے نکال دیا جائے تو وہ دوبارہ اللہ کی نافرمانیوں سے باز رہیں گے‘ مگر اس کے جواب میں انہیں ڈانٹ پلائی جائے گی۔ قرآن مجید میں اس کی تصویر کشی کرتے ہوئے فرمایا گیا:

﴿رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ ۝١٠٧ قَالَ اخْسَـُٔوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ۝١٠٨﴾ (المؤمنون)

’’اے ہمارے رب! نکال دے تو ہمیں یہاں سے‘ پھر اگر ہم دوبارہ ایسا کریں تو یقیناً ہم ظالم ہوں گے۔ ارشاد ہوگا: (دور ہو جاؤ میرے سامنے سے اور) پڑے رہو اسی میں پھٹکارے ہوئے اور مجھ سے بات نہ کرو!‘‘

دوزخیوں کے پچھتانے کا ذکر قرآن مجید میں کئی بار آیا ہے‘ سورۃ الشعراء میں الفاظ آئے ہیں: ﴿فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝١٠٢﴾ ’’کاش ہوتا ہمارے سامنے پلٹنے کا ایک موقع تو ہم ہو جاتے مؤمنین میں سے۔‘‘ جب کہ دوسرے مقامات پر ان کی حسرت بایں الفاظ ذکر ہوئی ہے: ﴿اَوْ تَقُوْلَ حِيْنَ تَرَى الْعَذَابَ لَوْ اَنَّ لِيْ كَرَّةً فَاَكُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝٥٨﴾ (الزمر) ’’یا کہے جب عذاب دیکھے‘ کاش مل جائے مجھے ایک اور موقع

اور ہو جاؤں میں شامل نیکوکاروں میں۔‘‘ اور ﴿يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا ۡ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۝٣٧﴾ (المائدہ) ’’وہ چاہیں گے کہ نکل جائیں آگ سے مگر وہ نہیں نکل پائیں گے اس میں سے‘ اور ان کے لیے ہوگا ہمیشہ رہنے والا عذاب۔‘‘

دوزخی عذاب کی شدّت سے گھبرا کر چاہیں گے کہ ان کی تکلیف میں کچھ کمی کر دی جائے۔ وہ جہنّم کے کارندوں سے سزا میں تخفیف کی خواہش کریں گے مگر ایسا نہیں ہوگا۔ سورۃ المؤمن میں فرمایا گیا: ﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ فِى النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوْا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ ۝٤٩﴾ ’’اور کہیں گے وہ لوگ جو آگ میں جل رہے ہوں گے جہنّم کے کارندوں سے کہ درخواست کرو اپنے رب سے کہ وہ تخفیف کر دے ہمارے لیے عذاب میں ایک ہی دن کی۔‘‘ عذاب دور کرنا تو کجا‘ اس میں کمی بھی نہیں کی جائے گی بلکہ وہ لگاتار بغیر وقفے کے عذاب میں مبتلا رہیں گے۔

سخت تپش کے باعث جہنّمی اہلِ جنّت سے گزارش کریں گے کہ ان پر تھوڑا سا پانی ہی ڈال دیں تاکہ ان کی تپش میں کچھ کمی ہو جائے:

﴿وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۭ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝٥٠﴾ (الاعراف)

’’اور پکاریں گے اہلِ دوزخ اہلِ جنت کو کہ ڈال دو ہم پر تھوڑا سا پانی یا اس میں سے ہمیں کچھ دے دو جو دیا ہے تم کو اللہ نے۔ وہ جواب دیں گے: یقیناً اللہ نے حرام کر دیا ہے ان چیزوں کو کافروں پر۔‘‘

گویا اہلِ جنت کا کھانا جہنمیوں کو ہرگز نہیں ملے گا۔ ان کی غذا بدذائقہ‘ سخت کڑوی اور بدشکل ہوگی۔ فرمانِ الٰہی ہے: ﴿اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ۝٤٣ طَعَامُ الْاَثِيْمِ ۝٤٤﴾ (الدخان) ’’بلاشبہ زقوم (تھوہر) کا درخت گناہگار کا کھانا ہے۔‘‘ یہ کانٹے دار درخت اتنا کڑوا ہے کہ گلے سے نہیں اُترتا۔

دوزخی جب محسوس کریں گے کہ انہوں نے گناہ اور نافرمانی کے کام فلاں فلاں کے کہنے پر

کیے تھے اور اب ہم سزا میں مبتلا ہیں تو خواہش کریں گے کہ بُرائی پر آمادہ کرنے والے انسانوں اور شیطانوں کو سامنے لایا جائے تا کہ وہ انہیں اپنے پاؤں تلے روندیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَقَالَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا رَبَّنَاۤ اَرِنَا الَّذَيۡنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الۡجِنِّ وَالۡاِنۡسِ نَجۡعَلۡهُمَا تَحۡتَ اَقۡدَامِنَا لِيَكُوۡنَا مِنَ الۡاَسۡفَلِيۡنَ ۝۲۹﴾ (حٰمٓ السجدۃ)

’’اور کہیں گے کافر: اے ہمارے رب! دکھا تو ہمیں وہ دونوں گروہ جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا جنوں اور انسانوں کے‘ تا کہ روند ڈالیں ہم انہیں اپنے پاؤں تلے۔‘‘

اس آیت سے یہ سبق ملتا ہے کہ ہر شخص کو نیک نہاد اشخاص کے ساتھ دوستی اور صحبت رکھنی چاہیے تا کہ وہ اسے اچھا مشورہ دیں۔ بُرا شخص تو ہمدردی کے روپ میں نافرمانی کرنے والے کام ہی کا مشورہ دے گا۔

شیطانی غلبے کے تحت انسان اس بات کو بھول جاتا ہے کہ کراماً کاتبین اُس کا ہر عمل نوٹ کر رہے ہیں‘ اور یہی اس کا نامہ اعمال ہے۔ اللہ تعالیٰ سے اس کا کوئی عمل چھپا ہوا نہیں ہے۔ روزِ محشر انسان کے اپنے اعضاء گواہی دیں گے کہ اس شخص نے ہمیں کس طرح استعمال کیا۔ دُنیا کی زندگی میں اعضاء انسان کا حکم مان رہے ہیں مگر آخرت میں وہ اعضاء سچی گواہی دیں گے۔ اُس وقت انسان اپنے اعضاء کو کہے گا کہ تم میرے خلاف کیوں گواہی دے رہے ہو؟ لیکن اس کا یہ شکوہ کسی کام نہ آئے گا۔ اس حوالے سے قرآن مجید میں فرمایا گیا:

﴿وَقَالُوۡا لِجُلُوۡدِهِمۡ لِمَ شَهِدۡتُّمۡ عَلَيۡنَا ؕ قَالُوۡۤا اَنۡطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِىۡۤ اَنۡطَقَ كُلَّ شَىۡءٍ﴾ (حٰمٓ السجدۃ:۲۱)

’’اور وہ کہیں گے اپنی کھالوں (اور اعضاء) سے کہ کیوں گواہی دی ہے تم نے ہمارے خلاف؟ وہ کہیں گے کہ گویائی دی ہے ہمیں اس اللہ نے جس نے گویائی بخشی ہر چیز کو۔‘‘

اگر یہ حقیقت ہر وقت انسان کے سامنے رہے کہ اس کے اپنے اعضاء اللہ کے حکم کے تحت اس کے برے اعمال بتا دیں گے تو وہ کبھی کوئی بُرائی نہ کرے۔

چونکہ موت سے انسان ہر قسم کے جسمانی دکھ اور بیماری سے آزاد ہو جاتا ہے‘ اسی تجربے کے تحت دوزخی موت کی تمنا کریں گے کہ شاید اس طرح ہمارا عذاب ختم ہو جائے۔

﴿وَاِذَاۤ اُلۡقُوۡا مِنۡهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيۡنَ دَعَوۡا هُنَالِكَ ثُبُوۡرًا ۝۱۳ لَا

تَدۡعُوا الۡيَوۡمَ ثُبُوۡرًا وَّاحِدًا وَّادۡعُوۡا ثُبُوۡرًا كَثِيۡرًا ۝۱۴﴾ (الفرقان)

’’اور جب وہ ڈالے جائیں گے دوزخ کی کسی تنگ جگہ میں مشکیں باندھ کر تو مانگنے لگیں گے وہ اس وقت موت۔ (کہا جائے گا:) مت مانگو آج صرف ایک موت بلکہ مانگو بہت سی موتیں۔‘‘

دوزخی اس انداز سے بھی موت مانگیں گے کہ انہیں زمین میں دفن کر کے مٹی برابر کر دی جائے تا کہ ان کا نام ونشان تک مٹ جائے اور اس طرح وہ عذاب سے چھوٹ جائیں: ﴿يَوۡمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَعَصَوُا الرَّسُوۡلَ لَوۡ تُسَوّٰى بِهِمُ الۡاَرۡضُ ؕ﴾ (النساء:۴۲)

’’اس دن آرزو کریں گے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور نافرمانی کی رسول کی کہ اے کاش برابر کر دی جائے ان پر زمین۔‘‘ مگر زمین کے نیچے دب جانے کا عمل تو دنیا کی زندگی میں ہی ہو سکتا تھا‘ جبکہ یہ تو آخرت ہے۔

جہنم مشرکوں‘ کافروں‘ بے ایمانوں‘ نافرمانوں‘ بدکرداروں اور اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والوں کو ان کی بداعمالیوں کے سبب ملے گی۔ جہنم سے بُری جگہ تصوّر میں بھی نہیں آ سکتی۔ جہنمی ناقابل برداشت اذیت سے مجبور ہو کر آرزو کریں گے کہ انہیں وہاں سے نکال کر دوبارہ دنیا میں بھیج دیا جائے‘ مگر ایسا نہیں ہوگا۔ جہنمیوں کی یہ آرزو قرآن مجید میں کئی مقامات پر بیان ہوئی ہے۔ مثلاً سورۃ الانعام میں مذکور ہے:

﴿وَلَوۡ تَرٰٓى اِذۡ وُقِفُوۡا عَلَى النَّارِ فَقَالُوۡا يٰلَيۡتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوۡنَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۝۲۷ بَلۡ بَدَا لَهُمۡ مَّا كَانُوۡا يُخۡفُوۡنَ مِنۡ قَبۡلُ ؕ وَلَوۡ رُدُّوۡا لَعَادُوۡا لِمَا نُهُوۡا عَنۡهُ وَاِنَّهُمۡ لَكٰذِبُوۡنَ ۝۲۸﴾

’’اور اگر آپ انہیں دیکھیں کہ جس وقت وہ کھڑے کیے جائیں گے دوزخ پر اور کہیں گے کاش ہم واپس بھیج دیے جائیں‘ پھر نہ جھٹلائیں ہم اپنے ربّ کی نشانیوں کو اور شامل ہو جائیں ایمان والوں میں —— بلکہ جو (عقائد واعمال) وہ پہلے سے چھپاتے تھے وہ سب ان کے سامنے ظاہر ہو جائیں گے —— اور اگر وہ واپس بھیج دیے جائیں تو پھر وہی کچھ کریں گے جس سے انہیں منع کیا گیا تھا اور وہ ہیں ہی جھوٹے۔‘‘

کچھ انسان ایسے ہیں جو زندگی میں اللہ کو چھوڑ کر دوسرے لوگوں کو اپنا کارساز سمجھ بیٹھتے ہیں اور ان سے اُمید رکھتے ہیں کہ وہ انہیں عاقبت کی گرفت سے بچا لیں گے۔ وہ عاقبت کی شفاعت

کو دنیا کی بے تکی سفارش کی مانند سمجھ کر دھوکے میں پڑ کر جہنّم کا ایندھن بن جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے: ﴿قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ؕ﴾ (الزمر: ۴۴) ''(اے نبی ﷺ! آپ) کہہ دیجیے کہ شفاعت تو سب کی سب اللہ کے اختیار میں ہے۔'' عاقبت کی بخشش کے لیے اگر انسان اس دنیا میں کچھ کرسکتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے۔ باری تعالیٰ ہی دعاؤں کو سنتا ہے اور کون ہے جو یہ اختیار رکھتا ہو! جن لوگوں نے دنیا کی زندگی میں اپنے سفارشی بنا رکھے تھے وہ قیامت میں انہیں تلاش کریں گے مگر کہیں نہ پائیں گے:

﴿فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ﴾ (الاعراف: ۵۳)

''(جہنمی کہیں گے:) کیا ہمارے لیے کچھ سفارش کرنے والے ہیں جو ہماری سفارش کریں یا ہمیں (دنیا میں) واپس بھیج دیا جائے تاکہ ہم ایسے اعمال کریں جو مختلف ہوں ان سے جو ہم کیا کرتے تھے۔''

توحید و رسالت اور آخرت پر ایمان رکھنے والوں کے لیے نصیحت ہے کہ وہ صرف ایمان کو کافی نہ سمجھیں بلکہ ایمانیات کے تقاضوں کے مطابق عمل بھی کریں۔ کتنے ہی مسلمان ہیں جو پشت ہا پشت سے ایمانیات پر یقین رکھتے ہیں مگر بے محابا کافرانہ اور مشرکانہ اعمال بھی کر رہے ہیں' حالانکہ قرآن مجید میں بار بار ایمان کے ساتھ عملِ صالح کو لازم قرار دیا گیا ہے۔ یقیناً کافرانہ اور مشرکانہ اعمال سزا کا باعث ہیں اگرچہ کرنے والے مؤمن ہی کیوں نہ ہوں' کیونکہ عمل کے بغیر ایمان کامل نہیں اور ایمان کے بغیر عمل بے فائدہ ہے۔ ﴿وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴿١٠٦﴾﴾ (یوسف) ''اور ان میں سے اکثر اللہ کو مانتے ہیں مگر اس طرح کہ اس کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں۔''

یہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کا حق ہے کہ اس کے سامنے دستِ سوال دراز کیا جائے۔ وہی حاجتوں کا پورا کرنے والا ہے اور وہی فریاد رس ہے۔ دعا خود ایک عبادت ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((إِنَّ الدُّعَاءَ هُوَ الْعِبَادَةُ)) (سنن الترمذی) ''بیشک دعا ہی اصل عبادت ہے۔'' اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنے کے لیے کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔ وہ تو ہر دعا کو سنتا ہے' چاہے کسی بھی وقت کی جائے: ﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ﴿١٦﴾﴾ (ق) ''اور ہم زیادہ قریب ہیں اُس کے اُس کی رگ جان سے بھی۔'' جو شخص اللہ کے سامنے دعا کرتا

ہے وہ غایت درجے اطمینان پاتا ہے۔ ﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ قف﴾ (آلِ عمران: ۱۹) ''بے شک اللہ تعالیٰ کے ہاں دین تو صرف اسلام ہی ہے''۔ اور دینِ اسلام اصل میں دینِ توحید ہے۔ قرآن مجید میں واضح طور پر بتا دیا گیا کہ: ﴿وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۘ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ قف﴾ (القصص: ۸۸) ''اور نہ پکارو تم اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود (جس سے دعا کی جائے)۔ کوئی معبود نہیں اُس کے سوا'' اللہ کے ساتھ یا اس کے علاوہ کسی کو حاجت روا یا دعاؤں کو سننے والا اور پورا کرنے والا ماننا شرک ہے۔ شرک وہ واحد گناہ ہے جس کے بارے میں ایک سے زیادہ بار کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ اسے نہیں بخشے گا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ﴾ (النساء: ۴۸، ۱۱۶)

''بے شک اللہ نہیں معاف کرتا یہ (گناہ) کہ شرک کیا جائے اس کے ساتھ اور معاف کر دیتا ہے شرک کے علاوہ (باقی گناہ) جس کے لیے چاہے۔''

الغرض ہر قسم کے گناہوں سے بچنے کی کوشش کرنا چاہیے' خاص طور پر اہلِ ایمان شرکیہ اعمال سے بچتے رہیں' اللہ کے سوا کسی سے گناہوں کی بخشش نہ مانگیں اور نہ ہی کسی طرح کی دعائیں مانگیں۔ سارے چھوٹے بڑے اللہ تعالیٰ کے بندے اور اُسی کے محتاج ہیں۔ نماز میں یہ الفاظ بار بار دہرائے جاتے ہیں: ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝﴾ (الفاتحۃ یعنی اے ہمارے خالق و مالک! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں اور چاہتے رہیں گے۔ جس طرح عبادت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے اسی طرح استعانت بھی اُس کے سوا کسی اور سے نہیں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے رسول اللہ ﷺ سے بھی کبھی استعانت نہیں چاہی۔ رسول اللہ ﷺ خود بھی ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝﴾ (الفاتحۃ) پر ہی عمل کرتے تھے اور صحابہ کرام ؓ کو بھی یہی تعلیم دیتے تھے۔ دوزخ سے بچنے کے لیے رسول اللہ ﷺ کی پیروی کرنا لازم ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایمانِ حقیقی کی دولت سے مالا مال فرمائے' نیک اعمال کرنے اور بُرے اعمال بالخصوص شرک اور شرکیہ اعمال سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے' تاکہ ہم دوزخ اور اس کے عذاب سے بچ کر ہمیشگی کی راحت حاصل کر سکیں۔ آمین! اَللّٰهُمَّ اَجِرْنَا مِنَ النَّارِ!

❁❁❁

یہودیوں پر اُمّتِ مُسلمہ کے احسانات

رضی الدین سیّد☆

یہودی جو آج مسلم دنیا کے بدترین دشمن بنے ہوئے ہیں، کبھی وہ بھی ماہ و سال تھے جب ہم ان کے محافظ تھے اور ان کے علوم وفنون کو پروان چڑھانے میں معاون و مددگار تھے۔ یہودیوں کے ساتھ حسنِ سلوک کا طرزِ عمل ریاستِ مدینہ کے قیام کے بعد ہی شروع کر دیا گیا تھا۔ ''میثاقِ مدینہ'' کے تحت کسی بھی تعصب کے بغیر انہیں اس شہر کا یکساں شہری قرار دیا گیا تھا۔ یہ ان کی بدقسمتی تھی کہ اپنی فطرت سے مغلوب ہو کر وہ اسی محسن ریاست کے خلاف سازشیں کرنے لگے۔ اگر دشمنوں کے ساتھ مل کر وہ سازشیں کرنے کھڑے نہ ہوتے تو شاید ہمیشہ مدینہ یا عرب ہی میں مقیم رہتے۔

فتحِ یروشلم کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے شہر کا نظم ونسق سنبھالا تو یہودیوں کو بھی وہاں آباد ہونے کی اجازت دی، حالانکہ عیسائیوں نے انہیں وہاں سے نکال باہر کیا تھا۔ ان کی ''دیوارِ گریہ'' کو بھی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہی نے دریافت کر کے انہیں دیا تھا۔ دوسری طرف چار سو سال تک یورپ جس طرح یہودیوں کے خلاف پنجے جھاڑ کر کھڑا ہوا تھا اور ایک ایک مرد، عورت اور بچے کو کولھو میں پیل کر انہیں اجتماعی طور پر ہلاک کر رہا تھا، اس پورے دور میں مسلم خلافتیں ہی انہیں اپنے ہاں پناہ و تحفظ مہیا کر رہی تھیں۔ اگر وہ ایسا نہ کرتیں تو ناممکن تھا کہ یہ قوم پھر کبھی دنیا میں باقی رہ جاتی۔ ان مسلم حکومتوں میں انہیں اہم عہدے اور وزارتیں تک دی گئیں اور ان کے عبادت خانوں کا مکمل تحفظ بھی کیا گیا۔

امریکہ میں مقیم معروف رِبی بنجامن بلیچ اگرچہ بہت متعصب ہے لیکن اپنی ضخیم کتاب "Jewish History and Culture" (شائع شدہ الفا، امریکہ) میں وہ بہرحال مسلمانوں کے احسانات کا ذکر بہت فخر سے کرتا ہے۔ لکھتا ہے کہ مغربی تعصب کے برعکس اسلامی دور میں یہودیوں کو حیرت انگیز طور پر برداشت، تہذیب اور علم و دانش کی معراج سے واسطہ پڑا اور برداشت کا یہ دورانیہ سینکڑوں سال تک جاری رہا۔ عظیم رومی سلطنت پر قابو پانے کے بعد اسلامی

☆ ای میل: national.a.research@gmail.com

ریاستوں میں یہودیوں نے اپنی زندگی کا عمدہ ترین تخلیقی و پُرامن دور پایا۔ اپنے اندر موجود علمی صلاحیتوں سے انہوں نے عربوں کو بھی فیض پہنچایا جسے انہوں نے قبول بھی کیا۔ آج جبکہ عیسائیوں کو یہودیوں کی ہمدرد قوم اور مسلمانوں کو اُن کی دشمن قوم سمجھا جاتا ہے، اسلام کے ابتدائی دور میں یہ معاملہ بالکل برعکس تھا۔ اسلامی دور میں یہودیوں کی علمی صلاحیتوں میں خاصا اضافہ ہوا تھا۔ یہودیوں کا سب سے بڑا فقہی مفکر مامون بن موسیٰ بھی دراصل سلطان صلاح الدین کا طبیبِ اعظم رہا تھا۔ (باب: یروشلم۔ ''The Crescent and the Cross'')

ایک اور خاتون مستشرق کیرن آرم سٹرانگ اپنی کتاب ''یروشلم: ایک شہر، تین مذاہب'' میں تحریر کرتی ہے کہ آخری صلیبی جنگ میں فتح یابی کے بعد سلطان صلاح الدین ایوبی نے یہودیوں کو بھی یروشلم آنے کی دعوت دی۔ فتح یابی کے بعد صلیبیوں نے انہیں یروشلم سے نکال باہر کیا تھا۔ ۱۱۹۰ء میں سلطان نے اسقلون کے یہودیوں کو اپنا صومعہ تعمیر کرنے کی اجازت دی تھی اور ان کے لیے مسلمانوں کے ساتھ کا علاقہ مختص کیا گیا تھا۔ ۱۵۳۵ء میں ایک اطالوی یہودی ڈیوڈ ڈی روزی نے یروشلم کا سفر کرنے کے بعد لکھا کہ فلسطین میں یہودی سرکاری منصبوں اور عہدوں پر فائز ہیں، یورپ میں جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں یہودیوں کے لیے کوئی خصوصی ٹیکس بھی نہیں ہے۔ کیرن آرم سٹرانگ لکھتی ہے کہ یہودی برادری کی خودمختاری کو عثمانی حکام نہ صرف تحفظ دیتے تھے بلکہ اس کی حوصلہ افزائی بھی کرتے تھے۔ یہودی یہاں خود کو اس قدر محفوظ و خوش حال سمجھتے تھے کہ ۱۵۲۳ء میں وہ اس یہودی کے خلاف خود اُٹھ کھڑے ہوئے تھے جو اپنے آپ کو یہودیوں کا مسیحا قرار دیتا تھا۔ (باب: عثمانیوں کا شہر)

رواداری کی ہماری تاریخ سفر کرتے ہوئے آگے بڑھتی ہے۔ عثمانی دور کے ایک ترک سفارت کار نے جنگ عظیم دوم میں اپنی جان کا خطرہ مول لے کر ۸۰ یہودیوں کا تحفظ کیا تھا۔ اس کا انتقال ۹۱ سال کی عمر میں جون ۲۰۰۲ء میں استنبول میں ہوا۔ سفارت کار کو اُس کی زندگی ہی میں، ۲۰۰۱ء میں، ترکی میں مقیم اسرائیلی سفیر یوری بارنیر (Uri Bar Ner) نے یہودیوں کی جان بچانے پر اپنے ملک کی طرف سے ایک میڈل سے نوازا اور اُس کا خصوصی شکریہ ادا کیا تھا۔ ترک سفیر ۱۹۴۱ء تا ۱۹۴۴ء فرانس میں متعین تھا۔ ۱۹۴۳ء کی ایک صبح اسے کسی یہودی مزدور نے آگاہ کیا کہ سمندری شہر ''مارسیلی'' کے ۸۰ ترک یہودی مزدوروں کو ایک مویشی گاڑی میں گرفتار کر کے لے جایا گیا ہے۔ خبر سنتے ہی سفیر ریلوے اسٹیشن کی طرف بھاگا جہاں ایک ڈبے میں اُس نے کئی یہودیوں کو ایک دوسرے کے اوپر پھینکا ہوا پایا۔ گسٹاپو کمانڈر نے غصے میں اُس سے سوال کیا:

"آپ کا یہاں کیا کام؟" سفیر نے کہا کہ یہ میرے ملک کے شہری ہیں' انہیں چھوڑ دو! اُس نے کہا: "یہودی یہودی ہوتا ہے' اس کا کسی ملک سے تعلق نہیں ہوتا"' بہادر ترک سفیر گاڑی پر چڑھ گیا۔ اگلے اسٹیشن پر اُسے جرمن افسران ملے اور بتایا کہ یہودیوں والی ٹرین تو یہاں سے نکل چکی ہے' ہم آپ کو اپنی کار کے ذریعے واپس آپ کے شہر چھوڑ دیتے ہیں۔ سفیر نے بتایا کہ ہمارے ۸۰ یہودی شہری جانوروں والی ٹرین میں ڈالے گئے ہیں اور مَیں یہاں ترک حکومت کا سفیر ہوں۔ جرمن حکام اس کی یہ جرأت دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے اور انہوں نے ٹرین سے تمام ۸۰ یہودیوں کو مجبوراً نیچے اتار دیا۔ اترتے ہی قیدی یہودیوں نے سفیر کا دلی شکریہ ادا کیا اور ایک ایک مزدور اس کے گلے لگا۔ ترک سفیر نے بتایا کہ انہیں متوقع موت سے بچانے پر اُسے جتنی خوشی ہوئی' اتنی خوشی اسے اب تک کبھی نہیں ہوئی ہے۔ ایک یہی نہیں بلکہ ترکی کے کئی اور سفارت کاروں نے بھی یہودیوں کی جان بچانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق جنگ عظیم دوم میں غیر جانبدار ترکی نے جرمنی کی گستاپو سے کم از کم بیس ہزار یہودیوں کی جانیں بچائی تھیں۔ (حوالہ: لوس اینجلیس ٹائمز' ۲۱ نومبر ۲۰۰۲ء)

اسی طرح مراکش کے بادشاہ سلطان محمد نے جنگ عظیم دوم کے دوران اپنے ملک کے یہودیوں کو فرانسیسی حکومت کی درخواست کے باوجود کسی قسم کی ایذا پہنچانے یا فرانس کے حوالے کرنے سے سختی سے انکار کر دیا تھا۔ سلطان نے کہا تھا: "ہمارے پاس یہودی نہیں بلکہ صرف مراکشی بستے ہیں"۔ خود یہودی بھی مراکش ہی کو اپنا وطن کہتے تھے۔ سلطان نے فرانسیسی حکومت سے دوٹوک طور پر کہہ دیا تھا کہ "مَیں یہود مخالف قوانین کو اپنے ہاں اختیار کرنے سے یکسر انکار کرتا ہوں۔ یہودی میری رعایا ہیں اور میری حفاظت میں ہیں"۔ ۱۹۶۱ء میں سلطان کی وفات پر وہاں کے ۷۵۰۰۰ یہودی مغموم وافسردہ تھے۔ ایک اور ترک سفارت کار صلاح الدین نے بھی درجنوں ترک یہودیوں کو جرمنی منتقل ہونے سے بچایا تھا۔ وہ لوگ یونان کی سرحد سے متصل علاقے میں مقیم تھے۔ (لوس اینجلیس ٹائمز' ۲۵ اپریل ۲۰۰۲ء) واضح رہے کہ یہ دورِ خلافتِ عثمانیہ کا تھا۔

معروف اسرائیلی اخبار "ہیریٹز" ۲۴ اکتوبر ۲۰۱۲ء کی اشاعت میں انکشاف کرتا ہے کہ ترک یہودی شہری جو یورپ کے مختلف حصوں میں تلاشِ معاش کے لیے سرگرداں تھے' انہیں Holocaust سے محفوظ رکھنے کی خاطر کئی ترک سفیروں اور قونصل جنرلوں نے گاڑیوں کا انتظام کر کے ہنگامی طور پر واپس استنبول روانہ کیا تھا۔ اس طرح ترکی نے اپنے ہزاروں یہودی شہریوں کو ہٹلر کے سفاکانہ قتل عام سے بچایا تھا۔

وکی پیڈیا اس حوالے سے بتاتی ہے کہ اسپین میں جب یہودیوں کی کڑی نگرانی کی جا رہی تھی' مسلم دنیا میں انہیں خوش آمدید کہا جا رہا تھا۔ عثمانی خلافت میں ایک اہم اقلیتی گروپ کی حیثیت سے وہ تجارت میں بھی مصروف رہے اور بے حد پُرسکون و مطمئن زندگی گزارتے رہے۔ (حوالہ: Jews in the Muslim World)

اگر ہم معروف مغربی مصنفین کی کتابیں پڑھیں تو اندازہ ہوگا کہ یہودی قوم پر مسلمانوں کے احسانات کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے وہ شرماتے نہیں ہیں۔ اسی باعث راقم سوچتا ہے کہ یہودیوں یا اسرائیل کی ہر بات کو تسلیم کر لینے یا مذاکرات کی خاطر اُن کے ساتھ میز پر جا بیٹھنے سے پہلے ہمارے مقتدر طبقے' خصوصاً عرب شاہوں اور پاکستانی حکمرانوں پر لازم ٹھہرنا چاہیے کہ وہ مسلم تاریخ کا مطالعہ ضرور کریں جو اوّل تا آخر رواداری و کشادہ دلی سے بھری ہوئی ہے۔ اس طرح خود مرعوب ہونے کی بجائے وہ صہیونیوں ہی کو مرعوب کر کے اُٹھیں گے۔ ہمارے بادشاہ اور وزرائے اعظم انہیں بتائیں کہ وہ ہم ہی تھے جنہوں نے عیسائیوں کے تشدد سے تمہیں بچایا تھا اور تمہارے علم و فن کو صیقل کیا تھا' ورنہ دنیا میں نہ تو تم موجود ہوتے اور نہ تمہارا علم باقی رہتا۔ لہٰذا کم از کم ہمارے اس احسان کا کوئی صلہ تو ہمیں دو۔ بجائے ہمارے فیاضانہ سلوک کے بدلے کے' تم الٹا فلسطینیوں ہی کو انفرادی و اجتماعی طور پر ہلاک کرتے رہتے ہو۔ اُن کی آبائی زمینیں بھی تم نے اُن سے چھین لی ہیں۔ وہ دن آخر کب آئے گا جب تم ہمارے ساتھ بھی برابری کا سلوک کرو گے؟ تمہاری تاریخ آپ ہی گواہی دے رہی ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ تم نے ہمیشہ کھلی چھپی دشمنی روا رکھی ہے۔ دنیا میں اگر تمہارے خلاف کوئی "ہولوکاسٹ" ہوا ہے تو اس کی ذمہ دار مغربی اقوام ہیں' نہ کہ مسلمان۔ سو اپنے ظلم کا بدلہ تمہیں انہی سے لینا چاہیے۔ ہمارے ساتھ تمہارا کیا لینا دینا!

انہی حقائق و شواہد کی بنا پر آخری ترک خلیفہ عبدالمجید نے یروشلم یہودیوں کے حوالے کر دینے کی درخواست کے جواب میں ان سے کہا تھا کہ "یروشلم تمہیں صرف میری لاش ہی پر مل سکتا ہے!" اور شاہ عبدالعزیز ابن سعود نے انہیں جواب دیا تھا کہ یہودیوں پر توڑے جانے والے مظالم کا ہم مسلمانوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اعتماد بھری اس گفتگو کے بعد مجال نہیں ہونی چاہیے کہ یہودی و صہیونی کسی مسئلے پر ہم پر کوئی دباؤ ڈال سکیں یا کوئی غلط فیصلہ ہم پر مسلط کر سکیں۔ افسوس کا مقام ہے کہ ہمارا مقتدر طبقہ اوّل تو ہمیشہ خوف زدہ رہتا ہے اور دوم تاریخ کے مطالعے سے بھی مطلق دلچسپی نہیں رکھتا۔ ایسے میں ان میں جرأت و بے خوفی پیدا ہو تو کہاں سے ہو! ❁❁❁

Oct. 2022
Vol.71

Regd. CPL No.115
No.10

Monthly **Meesaq** Lahore

سیرتِ مطہرہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے دلپذیر موضوع پر
بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے فکر کا نچوڑ

سیرتِ خیر الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام

سیرت طیبہ پر ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے آخری خطابات کا مجموعہ

عمدہ طباعت ۔ دیدہ زیب ٹائٹل
صفحات: 240 ۔ قیمت: 500 روپے

خود مطالعہ کیجیے، دوستوں کو تحفتاً پیش کیجیے

ملنے کا پتہ

مکتبہ خُدّامُ القرآن لاہور

قرآن اکیڈمی، 36 کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: (042)35869501-03
فیکس: (042)35834000 ای میل: maktaba@tanzeem.org
ویب سائٹ: www.tanzeem.org